مضامین اسلام

اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مقالات

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

صفحہ

باب اول

استدلالی منطق

صنعت کو دیکھ کر صانع کا تصور پیدا ہونا، یا واقعہ کو دیکھ کر صاحب واقعہ کا اقرار ایک بالکل فطری بات ہے۔ فطری منطق کے اعتبار سے اس میں کوئی شبہ نہیں، یہی فطری منطق ہے جس کو قدیم زمانہ میں عرب کے ایک دیہاتی شخص نے استعمال کرتے ہوئے کہا تھا:

سئل اعرابی عن الدلیل فقال - البعرة تدل علی البعیر والروث علی الحمیر وآثار الاقدام علی المسیر- فسماء ذات ابراج وارض ذات فجاج وبحار ذات امواج، اما تدل علی الصانع الحکیم -

(السعادة الابدیہ فی الشریعۃ الاسلامیہ، صفحہ ۴۲)

ایک اعرابی سے پوچھا گیا کہ خدا کے وجود کی دلیل کیا ہے۔ اس نے کہا کہ اونٹ کی مینگنی اونٹ پر دلیل ہوتی ہے۔ گدھے کی لید گدھے پر دلیل ہوتی ہے۔ پاؤں کے نشان چلنے والے پر دلیل ہوتے ہیں۔ پھر برجوں والا آسمان اور راستوں والی زمین اور موجوں والے سمندر، کیا یہ چیزیں حکمت والے صانع پر دلیل نہیں۔

کھلے ذہن والے انسان کے لیے یہ دلیل نہایت واضح اور قطعی ہے۔ مگر فلسفیانہ موشگافی پیدا کرنے والے بہت سے لوگوں نے اس دلیل کو ناکافی بتایا۔ انھوں نے کہا کہ یہ صرف ایک استنباطی دلیل ہے۔ یعنی بعض نشانیوں سے یہ مستنبط کیا گیا ہے کہ یہاں خدا جیسی ایک حقیقت موجود ہے۔ یہ خدا کے وجود پر بالواسطہ استدلال ہے نہ کہ براہ راست استدلال۔

یہ اعتراض قدیم زمانہ میں بظاہر وزنی معلوم ہوتا تھا۔ کیوں کہ انسانی علم کائنات کو ایک ایسی چیز فرض کیے ہوئے تھا جو براہ راست انسانی مشاہدہ میں آسکتی ہے۔ قدیم تصور یہ تھا کہ تمام چیزیں اپنے آخری تجزیہ میں ٹھوس مادی ذرات کا مجموعہ ہیں۔ ان کا مشترک نام ایٹم ہے۔ حتیٰ کہ نیوٹن کے نزدیک روشنی بھی چھوٹے چھوٹے ذرات کا مجموعہ تھی جو روشن چیز سے نکل کر فضا میں پھیل جاتے تھے۔ اس نظریہ کو ذرات نور کا نظریہ (carpuscles theory of light) کہا گیا۔

مگر یہ نظریہ صرف اس وقت تک تھا جب کہ انسانی مطالعہ کائنات کبیر کی سطح (microcosmic level) تک محدود تھا۔ جب انسانی علم اس ظاہری سطح سے گزر کر کائنات

صغیر کی سطح (macrocosmic level) تک پہنچا تو سارا معاملہ بالکل مختلف ہو گیا، جس ایٹم کو جزء لا یتجزٰی سمجھا جا رہا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ اور اس کے بعد تمام موجودات ایسی لہروں (waves) میں تبدیل ہو گئیں جن کو نہ دیکھا جا سکتا تھا اور نہ یہ ممکن تھا کہ ان کی پیمائش کی جا سکے۔

علم انسانی میں یہ تبدیلی بیسویں صدی عیسوی کے ربع اول میں پیدا ہوئی۔ اس کے نتیجہ میں قدرتی طور پر منطق یا اصول استدلال میں بھی تبدیلی آ گئی۔

اب یہ معلوم ہوا کہ کائنات کی کسی بھی چیز کی آخری نوعیت کو براہ راست طور پر جانا نہیں جا سکتا۔ ہمارے لیے صرف یہ ممکن ہے کہ چیزوں کے اثرات (effects) کو دیکھ کر یہ رائے قائم کریں کہ یہاں فلاں نوعیت کی چیز پائی جا رہی ہے۔ اس طرح علم انسانی سے براہ راست استدلال کا افسانہ ختم ہو گیا۔ اب یہ خود علمی سطح پر مان لیا گیا کہ بالواسطہ استدلال ایک معقول (valid) استدلال ہے۔ کیوں کہ اس کے سوا کوئی اور استدلال ہمارے لیے ممکن ہی نہیں۔

تین سو سال پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ہمارے لیے انتخاب براہ راست استدلال اور بالواسطہ استدلال میں ہے۔ چنانچہ انسان نے براہ راست استدلال کو اعلیٰ استدلال سمجھ کر اس کو لے لیا۔ اب معلوم ہوا کہ ایسا نہیں۔ بلکہ ہمارے لیے انتخاب بالواسطہ استدلال اور عدم استدلال میں ہے۔ یعنی ہم کو بالواسطہ استدلال کو استدلال ماننا ہوگا۔ اگر ہم بالواسطہ استدلال کو معقول استدلال نہ مانیں تو اس کے بعد ہمارے پاس استدلال کی کوئی اور بنیاد ہی باقی نہیں رہتی۔ اس نئی دریافت نے انسان کو مجبور کیا کہ وہ بالواسطہ استدلال کو معقول استدلال (valid argument) کی حیثیت سے تسلیم کر لے۔

موجودہ زمانہ کے تمام وہ نظریات جو سائنٹفک نظریات کہے جاتے ہیں اور جن کے اوپر نظری سائنس کی پوری عمارت قائم ہے، وہ سب کے سب بالواسطہ استدلال ہیں نہ کہ براہ راست استدلال۔

اس جدید علمی انقلاب کی روشنی میں دیکھئے تو عرب بدو کا مذکورہ استدلال عین علمی استدلال نظر آئے گا۔ علم انسانی کی دنیا میں اس تبدیلی نے موجودہ زمانہ میں اس سادہ استدلال کو عین سائنسی استدلال بنا دیا ہے۔ اب ان دونوں میں کوئی اصولی اور بنیادی فرق نہیں۔

قدیم سائنسی تصور کے مطابق، اس استدلال کی کمی یہ تھی کہ وہ ایک بالواسطہ استدلال تھا۔ مگر اب خود سائنس کے پاس بھی کسی سائنٹفک تصور کو پیش کرنے کے لیے جو منطقی بنیاد ہے وہ بھی یہی ہے۔ جدید سائنس کے تمام استدلالات بھی اصولی طور پر وہی ہیں جس کو اب تک مذہبی استدلال کہا جاتا تھا۔

علمی دنیا میں اس تبدیلی سے مزید یہ ثابت ہوا ہے کہ مذہبی دلیل کی بنیاد کائنات کی آفاقی فطرت پر تھی۔ یعنی انسان اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ جس علمی حد تک پہنچ سکتا ہے یا موجودہ نظام عالم انسان کو جس نوعیت کے استدلال کی اجازت دیتا ہے، وہی مذہب میں اول دن اختیار کر لیا گیا۔ مگر پچھلی صدیوں میں جو سائنس داں اور مفکر اٹھے، انھوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھتے ہوئے ایک ایسی علمی زمین پر کھڑا ہونا چاہا جو سرے سے ان کے لیے موجود ہی نہ تھی۔ چنانچہ مذہب نے اپنی آفاقیت کو باقی رکھا۔ اس کے برعکس انسان کا علمی دعویٰ محض زمانی ہو کر رہ گیا۔

جدید تاریخ کا یہ واقعہ انسانی علم کے مقابلہ میں مذہبی علم یا خدائی علم کی ابدیت کو ثابت کر رہا ہے۔ وہ مذہبی علم کی صداقت کا ایک آخری اور قطعی ثبوت ہے۔

عقلی استدلال

قرآن کی دعوت توحید کی دعوت ہے۔ قرآن شرک کی تردید کرتا ہے اور توحید کو ابدی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے اپنے مخالفین کو چیلنج دیتے ہوئے کہا ہے کہ ایتونی بکتاب من قبل ھذا او اثارۃ من علم (الاحقاف ۴) یعنی میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا کوئی علم لے آؤ جو چلا آتا ہو۔

مفسر ابن کثیر نے ان دونوں علموں کی تشریح نقلی علم اور عقلی علم کے الفاظ میں کی ہے (تفسیر ابن کثیر ۴/۱۵۴) گویا قرآن اپنے بنیادی پیغام کی صداقت کو جانچنے کے لیے مخاطب کو دو معیار دیتا ہے۔ ایک، سابق الہامی علم جو کتب مقدسہ کی صورت میں موجود ہے۔ دوسرے، وہ علمی اصول جو مسلسل تجربہ اور تحقیق کے بعد اہل عقل کے نزدیک مسلم بن گئے ہوں۔

جہاں تک قدیم مذہبی کتابوں کا تعلق ہے، یہ حیرت انگیز بات ہے کہ تمام تر تحریفات کے باوجود آج بھی وہ قرآن کے بنیادی پیغام کی تصدیق کر رہی ہیں۔ مثلاً تعداد کے اعتبار سے آج سب سے بڑا مذہب مسیحیت ہے۔ چرچ کے اعلان کے مطابق، مسیحیت کا مذہب تثلیث ہے۔ مگر خود عہد نامۂ جدید یا عہد نامہ قدیم سے تثلیث کا عقیدہ ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس موجودہ محرف متن میں بھی توحید کا عقیدہ واضح طور پر موجود ہے۔

جو شخص قرآن یا اسلام کی صداقت کو دلیل سے جانچنا چاہے اس کے لیے جانچنے کا دوسرا طریقہ مسلمہ عقلی علم ہے۔ یعنی علمی تحقیقات کے ذریعہ جو اصول اہل علم اور اہل عقل کے درمیان تسلیم شدہ بن گئے ہوں، ان کی روشنی میں جانچ کر قرآن کی صداقت کو معلوم کرنا۔

یہ عقلی مسلّمات محض عقلی مسلّمات نہیں ہوتے۔ وہ عالم فطرت کے ابدی حقائق ہوتے ہیں جن کو دریافت کر کے علماء اور عقلاء ان پر متفق ہو جاتے ہیں، قرآن خالق کائنات کا کلام ہے۔ اور عالم فطرت اسی خالق حقیقی کی مخلوق۔ اس طرح قرآن اور فطرت دونوں کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور جب دونوں کا سرچشمہ ایک ہو تو ان میں اختلاف کیوں کر واقع ہوگا۔

عقلی طریق استدلال یا وہ معتبر معیار تحقیق کیا ہے جس کو استعمال کر کے ایک شخص یہ اطمینان حاصل کرے کہ اسلام

ایک قابلِ اعتبار دین ہے اور اس کی تعلیمات اس لائق ہیں کہ آدمی ان پر یقین کرے اور ان کو اپنے عمل کی بنیاد بنائے۔

غالباً ۱۹۷۰ کی بات ہے۔ میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو ایک یونی ورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اسلام کے فلسفیانہ فکر پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اسلام میں ثانوی عقلیت (secondary rationalism) ہے۔ اسلام میں ابتدائی عقلیت (primary rationalism) نہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اسلامی فکر کا آغاز وحی کے عقیدہ سے ہوتا ہے۔ آدمی پیشگی طور پر وحی کو مسلّمہ صداقت مان کر سوچنا شروع کرتا ہے۔ جب کہ عام انسانی فلسفہ میں کوئی چیز پیشگی مسلّمہ کے طور پر نہیں مانی جاتی۔ بلکہ تحقیق و جستجو کے بعد جو بات ثابت ہوتی ہے اس کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کی بات بطور واقعہ درست ہے۔ مگر میں اس میں یہ اضافہ کروں گا کہ اس دنیا میں انسان کے لیے ثانوی عقلیت ہی ممکن ہے۔ ابتدائی عقلیت موجودہ دنیا میں انسان کے لیے قابلِ عمل اور قابلِ حصول نہیں۔

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم کو صرف محدود عقلی صلاحیت حاصل ہے۔ حقائق کی کائنات لامحدود ہے اور اس کے مقابلہ میں انسان کی عقل انتہائی محدود۔ اس لیے ابتدائی عقلیت کا اصول ایک دل پسند اصول تو ہو سکتا ہے مگر اس دنیا میں وہ قابلِ عمل اصول نہیں۔

خالص فنی اعتبار سے اسلام کی عقلیت اگرچہ ثانوی عقلیت ہے مگر وہ عام معنوں میں ادعائیت (dogmatism) کی قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اسلام کا طریقہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کے بارے میں ایک بیان (statement) دیتا ہے۔ اور اس کے بعد انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس بیان کو واقعاتِ معلومہ (known facts) پر جانچ کر دیکھو۔ اگر تم پاؤ کہ یہ بیان واقعاتِ معلومہ سے مطابقت رکھتا ہے تو تم کو مان لینا چاہیے کہ یہ عین درست ہے۔

علم کیا ہے، اور انسان اس علم تک کس طرح پہنچتا ہے یا پہنچ سکتا ہے، اس سلسلہ میں جدید سائنس نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ علم تک پہنچنے کے تین مرحلے ہیں :

۱۔ مشاہدہ (observation)

۲۔ مفروضہ (hypothesis)

۳۔ تصدیق (verification)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاً آدمی کے سامنے کچھ واقعات آتے ہیں۔ ان واقعات کی توجیہہ کے لیے اس کے ذہن میں ایک مفروضہ قائم ہوتا ہے۔ اب وہ مزید مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اگر مزید یا وسیع تر مطالعہ اس کے مفروضہ کی تصدیق کرے تو مان لیا جائے گا کہ وہ حقیقت ہے۔ اس آخری مرحلہ میں پہنچ کر ابتدائی مفروضہ ثابت شدہ حقیقت (proved fact) بن جاتا ہے۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ زمین پر قدیم انسان نے دیکھا کہ یہاں خشکی کے حصے بھی ہیں اور سمندر بھی۔ اس نے ابتدائی طور پر یہ مفروضہ قائم کیا کہ زمین پر آدھا حصہ خشکی ہے اور آدھا حصہ پانی۔ یہ مفروضہ یونانی فلسفیوں کے زمانے سے لے کر ابن خلدون تک قائم رہا۔

اس کے بعد خشکی اور سمندر کے سفروں سے آدمی نے یہ جانا کہ خشکی کے مقابلے میں پانی کا حصہ زمین پر زیادہ ہے۔ اس دوسرے مشاہدے سے پہلا مفروضہ رد ہو گیا۔ اب دوسرا مفروضہ یہ قائم ہوا کہ زمین پر پانی کا حصہ دو تہائی ہے اور خشکی کا حصہ ایک تہائی۔ اس کے بعد مزید ذرائع انسان کو حاصل ہوئے اور یہ ممکن ہو گیا کہ خشکی کے حصے اور پانی کے حصے کی باقاعدہ پیمائش کی جا سکے۔ چنانچہ باقاعدہ پیمائش سے معلوم ہوا کہ زمین کی سطح پر پانی کا حصہ ۷۱ فی صد ہے اور خشکی کا حصہ ۲۹ فی صد۔ بعد کے اس مشاہدہ نے دوسرے مفروضہ کی تصدیق کر دی اور وہ مسلّمہ حقیقت کے طور پر مان لیا گیا۔

قرآن کا فلسفہ بھی تقریباً یہی ہے۔ البتہ مقدمات کی ترتیب کے اعتبار سے دونوں میں معمولی فرق پایا جاتا ہے۔ قرآن کا فلسفہ یا قرآن کا طریق تفکیر معمولی فرق کے ساتھ یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے "مفروضہ" قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد "مشاہدہ" کی روشنی میں اس پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔ اور پھر آخر میں "تصدیق" کا درجہ آتا ہے۔ یعنی قرآن کے دعوئ (مفروضہ) کو لے کر اس پر غور کرنا۔ اور پھر غور و فکر کی سطح پر مفروضہ کی واقعیت ثابت ہونے کے بعد اس کو مسلّمہ حقیقت مان لینا۔ اسی آخری درجۂ معرفت کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان ہے۔

گویا سائنس کے طریق علم کی ترتیب یہ ہے کہ مشاہدہ۔ مفروضہ۔ تصدیق۔ اس کے بجائے قرآن کے طریق علم کی ترتیب یہ ہے کہ مفروضہ۔ مشاہدہ۔ تصدیق :

Science: observation—hypothesis—verification.
Qur'an : hypothesis—observation—verification.

دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عام انسانی فلسفہ میں فکر کا آغاز تلاش (pursuit) سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی فلسفہ میں فکر کا آغاز یافت (finding) سے ہوتا ہے۔ قرآن ابتداءً یہ دعویٰ یا علمی زبان میں مفروضہ پیش کرتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اور اس کائنات کا ایک انجام ہے۔ اس کے بعد قرآن تخلیقی دنیا کے مختلف شواہد (آیات) انسان کے سامنے لاتا ہے۔ اور انسان سے کہتا ہے کہ ان شواہد پر غور کرو اور دیکھو کہ کیا یہ شواہد قرآن کے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔

اب تک کے تجربات بتاتے ہیں کہ کائنات کے تمام حقائق معلومہ (known facts) قرآن کے بیان کی تصدیق کر رہے ہیں۔ کوئی بھی معلوم حقیقت ایسی نہیں جو قرآن کے بیان سے ٹکرانے والی ہو یا اس کو مشتبہ ثابت کرتی ہو۔

اس کی ایک مثال لیجئے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں یہ اعلان کیا کہ مجھ پر خدا نے اپنے فرشتے کے ذریعہ وحی بھیجی ہے۔ اس پر مکہ کے لوگوں نے کہا کہ ہم تمہاری بات کو صرف اس وقت مانیں گے جب کہ ہم اپنی آنکھ سے دیکھیں کہ فرشتہ خدا کی وحی لے کر آسمان سے تمہارے پاس آرہا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ لوگ تم سے وحی کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ وحی خدا کے حکم سے ہے اور تم کو صرف تھوڑا علم دیا گیا ہے (بنی اسرائیل ۸۵)

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا کہ مکہ کے لوگ پیغمبر اسلام کے دعویٰ رسالت پر براہِ راست دلیل مانگ رہے تھے۔ مگر قرآن نے یہ جواب دیا کہ تم اس معاملہ کو بالواسطہ دلیل یا استنباطی دلیل کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہو۔ کیونکہ تم اپنی محدودیت کی وجہ سے اس معاملہ میں براہ راست دلیل کا تحمل نہیں کر سکتے۔

یہ معاملہ اسی طرح متنازعہ صورت میں تاریخ میں چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹ ویں صدی میں سائنسی ذرائع کی دریافت کے بعد جدید مفکرین نے مزید یقین کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ ہمیں کسی معاملہ میں بالواسطہ یا استنباطی استدلال پر قانع رہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جدید ذرائع کی مدد سے تمام امور پر براہِ راست دلیل قائم کر سکتے ہیں۔

مگر بیسویں صدی کی تحقیقات نے آخری طور پر قرآن کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان کی ذہنی محدودیت فیصلہ کن طور پر اس راہ میں حائل ہے کہ وہ کسی بھی حقیقت پر

براہ راست دلیل قائم کر سکے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں متفقہ طور پر مان لیا گیا کہ بالواسطہ یا استنباطی استدلال عین معقول استدلال (valid arguments) ہے، بشرطیکہ وہ ثابت شدہ مشاہدات پر مبنی ہو اور تمام متعلق مشاہدات کی زیادہ بہتر توجیہہ کرتا ہو۔

مثال کے طور پر نظریۂ ارتقاء (Evolution theory) کو اسی بنا پر سائنس دانوں کے درمیان عمومی قبولیت (general acceptance) کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ کچھ لوگوں نے اس کو ثابت شدہ حقیقت (proved fact) کہنا شروع کر دیا۔ حالانکہ ارتقاء کا نظریہ اتنے لمبے ماضی سے تعلق رکھتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کے عمل کا براہ راست مشاہدہ کیا جا سکے یا اس پر براہِ راست دلیل قائم کی جائے۔ ارتقاء کا نظریہ تمام تر ایک استنباطی نظریہ ہے نہ کہ براہ راست مشاہدہ میں آنے والا نظریہ۔

نظریۂ ارتقاء کیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کا فارمولا چند لفظوں میں یہ ہے ــــــ دوبارہ پیدائش، فرق اور فرق کا باقی رہنا :

Reproduction, Variation and Differential survival

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حیوان کے یہاں توالد و تناسل سے بچے پیدا ہوئے۔ ان میں باہم فرق تھا۔ مثلاً کوئی چھوٹا تھا کوئی بڑا۔ بڑے بچے توالد و تناسل کے عمل کے تحت دوبارہ تھوڑا تھوڑا بڑے ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ بکری کا بچہ لمبی مدت تک فرق جمع ہونے کے نتیجہ میں زرافہ بن گیا۔ ارتقاء پسند عالم ایک طرف بکری کے ڈھانچہ کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف زرافہ کے ڈھانچہ کو، اور پھر وہ فرض کر لیتا ہے کہ ان دونوں کے بیچ میں اور بہت سی نسلیں ہیں جو ان دونوں کو جوڑتی ہیں۔ گویا وہ دو چیزوں کی موجودگی سے تیسری چیز کی موجودگی کا قیاس کرتا ہے۔

اس سے قطع نظر کہ یہ نظریہ صحیح ہے یا غلط، منطقی اعتبار سے یہ استدلال سراسر استنباطی استدلال ہے۔ اسی طرح کے استنباطی استدلالات پر ان تمام نظریات کی بنیاد قائم ہے جن کو موجودہ زمانے میں سائنٹفک نظریات کہا جاتا ہے۔

سائنس کے حلقے میں جتنے بھی نظریات قائم کیے گئے ہیں وہ سب اسی طرح بالواسطہ استدلال پر مبنی ہیں۔ یہ نظریات اس وقت تک قائم رہتے ہیں جب تک کوئی نیا مشاہدہ سابقہ توجیہہ یا

استنباط کو مشتبہ ثابت نہ کر دے۔

اسلامی عقائد پر منطقِ استدلال کی نوعیت بھی عین یہی ہے۔ اگر کائناتی مشاہدات اسلامی عقائد کی تائید کرتے ہوں اور ان مشاہدات سے جائز طور پر ان کا استنباط ہو رہا ہو تو وہ عین جدید سائنسی منطق کے مطابق درست اور قابلِ تسلیم قرار پائیں گے۔ صرف اس بنا پر ان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ وہ استنباطی استدلال پر مبنی ہیں۔ ایسا کرنے کے بعد صرف اسلامی عقائد ہی رد نہیں ہوں گے بلکہ خود سائنس کا پورا قلعہ بھی مکمل طور پر منہدم ہو جائے گا۔

قرآن میں ۱۴۰۰ سال پہلے یہ کہا گیا تھا کہ انسان کو صرف علمِ قلیل (بنی اسرائیل ۸۵) دیا گیا ہے۔ موجودہ زمانے میں خالص سائنسی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسانی ذہن کی کچھ ناگزیر محدودیتیں (limitations) ہیں اور ان محدودیتوں کی وجہ سے انسان کے لیے صرف محدود علم تک پہنچنا ممکن ہے۔ چنانچہ جدید سائنسی منطق کا یہ کہنا ہے کہ ہم اپنی موجودہ صلاحیتوں کے ساتھ صرف قرینہ (probability) تک پہنچ سکتے ہیں۔ قرینے سے آگے ہمارے علم کی رسائی ممکن نہیں۔

جدید سائنس کا یہ موقف اسلام کی اس عقلیت کو برحق ثابت کرتا ہے جس کو ثانوی عقلیت کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر سائنس کا موقف اور اسلام کا موقف دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ سائنس کا موقف جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں یہ ہے کہ ہم ایک مفروضہ قائم کریں اور ممکن تجربات اور مشاہدات پر ان کو جانچیں۔ اگر ہمارے تجربات اور مشاہدات اس مفروضہ کی تصدیق کریں تو ہمیں گمان کرنا چاہیے کہ مفروضہ درست ہے۔

عین یہی موقف اسلامی فلسفہ کا بھی ہے۔ اسلام یہ کرتا ہے کہ وہ وحی کی صورت میں ہمارے سامنے ایک "مفروضہ" رکھ دیتا ہے۔ اور یہ کہتا ہے کہ مشاہدات اور تجربات کی جو بھی معلوم مقدار ہے، اس پر جانچ کر اسے دیکھو۔ اگر معلوم مشاہدات اور تجربات اس سے نہ ٹکرائیں، بلکہ وہ اس کی تصدیق کریں تو یہ اس بات کا قرینہ ہوگا کہ وحی کی صورت میں جو مفروضہ قائم کیا گیا وہ عین درست ہے۔

نیوٹن نے دیکھا کہ سیب درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گر گیا۔ اس سے اس نے یہ نظریہ یا مفروضہ قائم کیا کہ زمین میں کھینچنے کی طاقت ہے۔ اس واقعہ میں سیب کا گرنا ایک مشہود واقعہ ہے، مگر زمین کی قوتِ کشش ایک غیبی واقعہ۔ اس واقعہ میں سائنس داں نے ایک غیبی واقعہ کو صرف اس لیے مان لیا کہ

ایک مشہود واقعہ اس کی موجودگی کا قرینہ پیش کر رہا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس نے "گرنے" کو دیکھ کر "گرانے والے" کا اقرار کر لیا۔ اصولی طور پر، ٹھیک یہی طریق استدلال قرآن میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ قرآن بھی یہی کرتا ہے کہ وہ مشہود حقائق سے غیبی حقائق پر دلیل قائم کرتا ہے۔ وہ واقعہ کی بنیاد پر صاحب واقعہ کو ماننے کی دعوت دیتا ہے۔

اس طرز استدلال کی ایک مثال قرآن میں یہ ہے : افعیینا بالخلق الاول بل هم فی لبس من خلق جدید (کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے عاجز رہے، بلکہ یہ لوگ از سر نو پیدا کرنے کی طرف سے شبہ میں ہیں) ۵۰/۵۱

سورہ ق کی اس آیت میں تخلیق اول سے تخلیق ثانی پر استدلال کیا گیا ہے۔ اس استدلال کی منطق یہ ہے کہ پہلے زندگی بعد موت کا "دعویٰ" پیش کیا گیا۔ اس کے بعد زندگی قبل موت کا مشاہدہ سامنے لایا گیا۔ اور پھر کہا گیا کہ جب پہلی بار بے زندگی سے زندگی کا وجود میں آنا ممکن تھا تو دوسری بار بے زندگی سے زندگی کا وجود میں آنا کیوں ناممکن ہوگا۔

انسان خود اپنے وجود کی صورت میں اور دوسرے بے شمار انسانوں کی موجودگی کی صورت میں پہلی تخلیق کا تجربہ کر رہا ہے۔ وہ دیکھ رہا ہے کہ انسان ایک مکمل وجود کے طور پر پہلی بار دنیا میں آتا ہے۔ اس کے بعد وہ مر کر دوبارہ اپنی قبل از پیدائش حالت کی طرف واپس چلا جاتا ہے۔

گویا کہ انسان حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آیا۔ اور اس کے بعد پھر حالتِ موت میں چلا گیا۔ اب اگر ایک بار حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آنا ممکن تھا تو دوسری بار حالتِ موت سے حالتِ زندگی میں آنا کیوں ناممکن ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ پہلی بار زندگی کا ثابت ہونا، دوسری بار زندگی کو اپنے آپ ثابت کر دیتا ہے۔

برٹرینڈ رسل ایک ملحد فلسفی ہے۔ مگر اس نے بالواسطہ طور پر اس واقعہ کا اعتراف کیا ہے، اس نے لکھا ہے کہ اہلِ مذاہب کے دلائل میں کم از کم ایک دلیل ایسی ہے جس کو منطقی دلیل (logical argument) کہا جاسکتا ہے۔ یہ نظم کے ذریعہ استدلال (argument from design) ہے جس سے خدا کے وجود کو ثابت کیا جاتا ہے، یعنی جب دنیا میں نظم ہے تو لازم ہے کہ اس کا ایک ناظم بھی ہو۔

برٹرینڈ رسل نے اگرچہ خود اس دلیل کو ماننے سے انکار کیا ہے۔ تاہم وہ مانتا ہے کہ اپنی نوعیت (nature) کے اعتبار سے یہ دلیل ایک خالص سائنسی دلیل ہے۔

Bertrand Russell, *Why I am not a Christian*, p. 9

حقیقت یہ ہے کہ اصولی اعتبار سے، قرآن کے استدلال اور سائنس کے استدلال میں کوئی فرق نہیں۔ تمام سائنسی نظریات میں معلوم سے نامعلوم پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ اسی طرح قرآن میں بھی معلوم سے نامعلوم یا شہود سے غیب پر دلیل قائم کی گئی ہے۔ قرآن کا طریق استدلال بھی اتنا ہی سائنٹفک ہے جتنا علوم مادی کا استدلال۔

اسلامی فلسفہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے خالص سائنٹفک فلسفہ ہے۔ جو لوگ سائنٹفک فلسفہ کو مانتے ہوں، ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ اسلامی فلسفہ کی معقولیت (validity) کو پوری طرح تسلیم کر لیں۔ خالص علمی اعتبار سے، اس موقف کے سوا کوئی اور موقف انسان کے لیے درست نہیں۔

قرآنی فلسفہ اور سائنسی فلسفہ میں اصل فرق مقدمات کی ترتیب کا ہے نہ کہ ثانوی عقلیت اور ابتدائی عقلیت کا۔ موجودہ دنیا میں انسان کے لیے عملاً ایک ہی طریق استدلال ممکن ہے، اور قرآن اور سائنس دونوں کا طریق استدلال بنیادی طور پر یہی ہے۔

نیاز فتح پوری (۱۹۶۶-۱۸۸۴) کا ماہنامہ نگار بہت مشہور رہا ہے۔ انھوں نے نگار (لکھنؤ) کے شمارہ جون ۱۹۳۲ میں ایک بار لکھا تھا :

"عہد حاضر میں علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے عمل و خیال کی بالکل نئی طرح ڈال کر حریت فکر و ضمیر کی دولت سے دماغوں کو مالامال کر دیا ہے۔ پہلے اگر خدا کی وحدانیت سے بحث کی جاتی تھی تو اب سرے سے خدا کا وجود ہی محل نظر بنایا جاتا ہے۔ اگر پہلے رسول کی ہدایت اس کے معجزوں سے ثابت کی جاسکتی تھی تو اب علوم مقناطیسیہ انھیں معجزوں کی دلیل پر ہزاروں رسول و نبی پیدا کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ پہلے ایک واعظ آسمان کی طرف دیکھ کر عرش و کرسی والے خدا کو پکار سکتا تھا۔ لیکن آج جب کہ آسمان ہی کوئی چیز نہ رہا اس کا ایسا کرنا کسی طرح مفید یقین نہیں ہو سکتا۔ الغرض اب زمانہ یومنون بالغیب کا نہیں رہا۔ بلکہ اب زمانہ یومنون بالتجربۃ والشھود کا ہے"۔

موجودہ صدی کے ابتدائی دور میں عام طور پر آزاد خیال لوگوں کا یہی ذہن تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ غیبی حقیقتوں پر ایمان زمانہ جاہلیت یا قبل از سائنس زمانہ کا ایک مظہر تھا۔ اب سائنس نے علم کا جو دروازہ کھولا ہے اس کے بعد انسان تجربہ اور مشاہدہ کے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ اب ہمیں انھیں چیزوں کو ماننا ہے جو براہ راست ہمارے مشاہدہ میں آئیں۔ جو چیز مشاہدہ میں نہ آئے وہ بے حقیقت مفروضہ ہے۔ اس لیے اس کو ماننے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا۔

مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، یہ ایک ایسا نظریہ تھا جو جلدی میں قائم کر لیا گیا تھا۔ نیوٹن اور اس کے قریبی زمانہ کے سائنس دانوں کی تحقیقات کے فوری نتائج نے انسان کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر دیا کہ کائنات قابل مشاہدہ ہے۔ اور جب کائنات قابل مشاہدہ ہے تو وہ تمام تصورات اپنے آپ غیر حقیقی قرار پاتے ہیں جو مشاہدہ اور تجربہ کی گرفت میں نہ آتے ہوں۔

مگر یہ نظریہ اس وقت تک تھا جب کہ سائنس دانوں کی تحقیق کائنات کبیر (macrocosms) کی سطح پر چل رہی تھی۔ جب ان کی تحقیق مزید آگے بڑھ کر کائنات صغیر (microcosm) کے دائرہ میں داخل ہو گئی تو علماء سائنس کو معلوم ہوا کہ یہاں سارا معاملہ غیر مشاہداتی ہے۔

آسمان میں گردش کرتے ہوئے بڑے شمسی نظام کو وہ اپنی دوربینوں سے دیکھ سکتے تھے۔ مگر ایٹم کے اندر گردش کرتا ہوا چھوٹا شمسی نظام ان کی انتہائی طاقت ور خوردبینوں کی پہنچ سے بھی باہر تھا۔ اس علمی ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا فکری ڈھانچہ ٹوٹ گیا۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے اگر یومنون بالتجربۃ والشھود کا دور چھایا ہوا نظر آتا تھا، تو دوسری عالمی جنگ کے بعد دوبارہ یومنون بالغیب کا دور تاریخ میں لوٹ آیا۔

نیاز فتح پوری کے مذکورہ بالا مضمون چھپنے کے تقریباً ۳۵ سال بعد میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ فلسفی تھے۔ اسی کے ساتھ وہ پوری طرح ملحد ہو چکے تھے۔ وہ خدا جیسی کسی ہستی کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ عقیدۂ خدا کے مسئلہ پر گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے ایک سوال کیا۔ یہ ایک مختصر سوال تھا۔ میں نے اس کا جو جواب دیا وہ بھی بالکل مختصر تھا۔ وہ سوال و جواب یہ تھا:

خدا کو ثابت کرنے کے لیے آپ کے پاس کرائٹیرین کیا ہے۔

وہی کرائٹیرین جو آپ کے پاس کوئی چیز ثابت کرنے کے لیے ہو۔

میرا جواب بظاہر نہایت مختصر تھا۔ مگر اس کو سنتے ہی وہ صاحب بالکل خاموش ہو گئے۔ ان کی خاموشی کی وجہ وہ انقلاب تھا جو سائنسی طریق استدلال کے اندر موجودہ زمانہ میں پیش آیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ مذکورہ صاحب نے اپنا سوال ماضی کے پس منظر میں کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حقیقت کو مشاہداتی معیار پر ثابت کیا جاسکتا ہے، اور چونکہ خدا کو مشاہداتی معیار پر ثابت کرنا ممکن نہیں، اس لیے خدا ایک غیر حقیقی مفروضہ ہے، علمی اعتبار سے اس کا کوئی وجود نہیں۔

مگر میرے جواب نے انھیں یاد دلایا کہ وہ بیسویں صدی کے نصف ثانی میں ہیں۔ اور اب بیسویں صدی کے نصف ثانی میں تمام حقیقتیں، حتیٰ کہ خود سائنسی حقیقتیں بھی، غیبی حقیقتیں بن چکی ہیں۔ اب وہی بالواسطہ یا استنباطی استدلال خود سائنس کی دنیا میں استعمال ہو رہا ہے جو پہلے مذہب میں استعمال کیا جاتا تھا۔ اب وہ دور آگیا ہے کہ کسی بھی حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے غیر مشاہداتی معیار ہی واحد قابل عمل معیار ہے، خواہ وہ حقیقت مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔

حقیقت یہ ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہر منکر دوبارہ خدا کا اقرار کرے۔ جدید حقائق کے ظہور کے بعد انکار کے رویہ پر قائم رہنے کی کوئی علمی بنیاد باقی نہیں رہتی۔

مطبوعہ : اسلام اور عصر جدید، دہلی، جنوری ۱۹۹۱

مضحکہ خیز

اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) ۱۹۴۲ میں پیدا ہوئے۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں میتھمیٹکس کے شعبہ میں لوکاسین پروفیسر ہیں۔ یہ وہ علمی منصب ہے جو اس سے پہلے نیوٹن اور ڈیراک جیسے اعلیٰ سائنس دانوں کو حاصل رہا ہے۔ وہ آئن سٹائن کے بعد سب سے زیادہ ممتاز نظریاتی طبیعیات داں (theoretical physics) سمجھے جاتے ہیں۔

اسٹیفن ہاکنگ کی ایک کتاب نیویارک سے ۱۹۸۸ میں چھپی ہے۔ یہ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ہے —— وقت کی مختصر تاریخ:

A Brief History of Time

یہ ایک بہت دلچسپ اور سبق آموز کتاب ہے۔ وہ اتنی مقبول ہوئی کہ صرف ایک سال میں اس کے چودہ اڈیشن چھاپے گئے۔ اس کتاب کا آغاز حسب ذیل سطروں سے ہوتا ہے:

"ایک مشہور سائنس داں نے ایک بار فلکیات کے موضوع پر ایک عوامی لکچر دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ برٹرینڈ رسل تھا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور کس طرح سورج ہماری کہکشاں کے مرکز میں گھومتا ہے جو کثیر ستاروں کا ایک مجموعہ ہے۔ لکچر کے خاتمہ پر ایک چھوٹی بوڑھی عورت

A well-known scientist (some say it was Bertrand Russell) once gave a public lecture on astronomy. He described how the earth orbits around the sun and how the sun, in turn, orbits around the centre of a vast collection of stars called our galaxy. At the end of the lecture, a little old lady at the back of the room got up and said: "What you have told us is rubbish. The world is really a flat plate supported on the back of a giant tortoise." The scientist gave a superior smile before replying, "What is the tortoise standing on ?" "You're very clever, young man, very clever," said the old lady. "But it's turtles all the way down!"

Most people would find the picture of our universe as an infinite tower of tortoises rather ridiculous, but why do we think we know better? What do we know about the universe, and how do we know it? Where did the universe come from, and where is it going? Did the universe have a beginning, and if so, what happened before then? What is the nature of time! Will it ever come to an end? Recent breakthroughs in physics, made possible in part by fantastic new technologies, suggest answers to some of these longstanding questions. Some-day these answers may seem as obvious to us as the earth orbiting the sun—or perhaps as ridiculous as a tower of tortoises. Only time (whatever that may be) will tell.

کمرہ کے پچھلے حصہ سے اٹھی اور کہا: تم نے جو کچھ ہمیں بتایا وہ بالکل لغو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا پلیٹ کی مانند چپٹی ہے جو ایک بہت بڑے کچھوے کی پیٹھ پر ٹکی ہوئی ہے۔ سائنس داں جواب دینے سے پہلے فاتحانہ انداز سے مسکرایا اور پھر خاتون سے پوچھا کہ یہ کچھوا کس چیز کے اوپر کھڑا ہے۔ بوڑھی عورت بولی: اے نوجوان، تم بہت چالاک ہو، مگر یہ کچھوے پر کچھوا ہے اور اسی طرح یہ سلسلہ نیچے تک چلا گیا ہے۔

بہت سے لوگ ہماری دنیا کی اس تصویر کو مضحکہ خیز سمجھیں گے کہ کچھوؤں کا ایک لامتناہی کھمبا ہے جس کے اوپر یہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ مگر کیوں ہم ایسا سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ اس سے بہتر ہے۔ ہم کائنات کے بارہ میں کیا جانتے ہیں اور ہم کس طرح اس کو جانتے ہیں۔ کائنات کہاں سے آئی اور وہ کہاں جا رہی ہے۔ کیا کائنات کا ایک آغاز ہے اور اگر ایسا ہے تو اس سے پہلے جو گزرا وہ کیا تھا۔ وقت کی نوعیت کیا ہے۔ کیا وہ کبھی ختم ہوگا۔ فزکس کے حالیہ انکشافات نے جزئی طور پر نئی حیرت ناک ٹکنالوجی کو ممکن بنا دیا ہے۔ اس سے کچھ قدیم سوالوں کے جواب معلوم کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ کچھ دن تک یہ جوابات ہم کو اسی طرح واضح دکھائی دے سکتے ہیں جیسے کہ سورج کے گرد زمین کا گھومنا۔ یا شاید وہ آئندہ اتنے ہی مضحکہ خیز نظر آنے لگیں جیسا کہ کچھوؤں کا کھمبا۔ صرف وقت، خواہ وہ جو بھی ہو، اس کے بارہ میں بتا سکے گا۔" صفحہ ۱-۲

جدید نظریات کے مضحکہ خیز ثابت ہونے کے لئے ہمیں مستقبل کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔ اہل دانش کے لئے ان کا مضحکہ خیز ہونا آج ہی معلوم اور ثابت شدہ ہے۔ مثلاً جدید سائنسی فکر کے مطابق دنیا کے واقعات اسباب وعلل کی ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب ہے، اور پھر اس سبب کے پیچھے ایک اور سبب۔ اس طرح یہ سلسلہ برابر چلا جا رہا ہے۔ اس قسم کا لامتناہی سلسلۂ اسباب بلاشبہہ اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا کہ کچھوؤں کی لامتناہی قطار۔

زندگی اور کائنات کی حقیقت کے بارہ میں آج کا انسان عجیب عجیب غلط فہمیوں میں پڑا ہوا ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک بے مقصد ہنگامہ ہے۔ وہ اپنے آپ شروع ہوا اور اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کسی کا خیال ہے کہ بہت سی روحیں یا دیوتا ہیں جو اس دنیا کے مالک ہیں۔ کوئی اسباب وعلل یا قانون اتفاق (law of chance) کے تحت اس کی تشریح کر رہا ہے۔ وغیرہ

یہ تمام باتیں بلا شبہ لغو ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صرف ایک خدا ہے جو تمام چیزوں کا مالک ہے۔ اسی نے انسان کو اور کائنات کو پیدا کیا۔ وہی اس کو چلا رہا ہے۔ یہ دنیا کوئی الل ٹپ یا بے مقصد دنیا نہیں۔ یہ خدا کے منصوبہ کے مطابق ہے۔ اس کا آغاز اور اس کا انجام دونوں منصوبۂ خداوندی کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مذہب اور جدید چیلنج)

انسان کے بارہ میں خدا کا منصوبہ یہ ہے کہ اس نے انھیں پیدا کر کے امتحان کے لئے موجودہ دنیا میں رکھا ہے۔ اس کا یہ امتحان پیدائش سے موت تک جاری رہتا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی کے جزا، کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اپنے دنیوی عمل کے مطابق، یا تو جنت کی پر راحت زندگی پائے گا یا جہنم کے عذاب خانہ میں داخل کر دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے پاس جو کچھ ہے وہ بر بنائے امتحان ہے، آخرت میں جو کچھ اس کو دیا جائے گا وہ بر بنائے استحقاق ہوگا۔ یہ فرق پورے معاملہ کو آخری حد تک بدل دے گا۔ موجودہ دنیا میں ہر چیز ہر آدمی کو ملی ہوئی ہے۔ کیوں کہ امتحان کے لئے اس کو سب کچھ دینا ضروری تھا۔ اگر چیزیں اور مواقع نہ دئے جائیں تو آدمی کا امتحان کیسے ہوگا۔ مگر موت کے بعد آنے والی دنیا میں صورت حال یکسر بدل جائے گی۔

جو آدمی موجودہ دنیا میں اپنا استحقاق ثابت نہ کر سکے، وہ آخرت کے عالم میں اس طرح داخل ہوگا کہ وہاں وہ بالکل خالی ہاتھ ہوگا۔ ہوا اور پانی اور روشنی بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو بے بسی کے عالم میں پائے گا۔ موجودہ دنیا میں اس کو ہر چیز اپنی نظر آتی ہے۔ آخرت میں ہر چیز اس کے لئے غیر ہو جائے گی۔ وہ ایسے ماحول میں ہوگا جہاں اجنبیت اور بے چارگی کے سوا کوئی اس کا استقبال کرنے والا نہیں۔

یہی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن میں ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے: اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہے، اگر تم سچے ہو۔ کاش یہ انکار کرنے والے اس وقت کو جانتے جب وہ آگ کو اپنے سامنے سے نہ روک سکیں گے اور نہ اپنے پیچھے سے۔ اور نہ ان کو مدد پہنچے گی۔ بلکہ وہ اچانک ان پر آجائے گی، پس وہ حیران رہ جائیں گے، پھر وہ نہ اس کو دفع کر سکیں گے اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی (الانبیاء ۳۸ - ۴۰)

ایک سوال

کہا جاتا ہے کہ خدا کی بنیاد پر کائنات کی توجیہہ کرنا بھی مسئلہ کا حل نہیں۔ کیوں کہ پھر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا تو خدا کو کس نے بنایا۔

مگر یہ ایک غیر منطقی سوال ہے۔ اصل مسئلہ "بے سبب" خدا کو ماننا نہیں ہے۔ بلکہ دو "بے سبب" میں سے ایک بے سبب کو ترجیح دینا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک پوری کائنات موجود ہے۔ ہم اس کو دیکھتے ہیں۔ ہم اس کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ہم کائنات کے وجود کو ماننے پر مجبور ہیں۔ ایک شخص خدا کو نہ مانے، تب بھی عین اسی وقت وہ کائنات کو مان رہا ہوتا ہے۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ آدمی کائنات کو بے سبب مانے۔ مگر اس قسم کا عقیدہ ممکن نہیں۔ کیوں کہ کائنات میں تمام واقعات بظاہر اسباب وعلل کی صورت میں پیش آتے ہیں۔ ہر واقعہ کے پیچھے ایک سبب کارفرما ہے۔ اس طرح خود کائنات کی اپنی نوعیت ہی یہ چاہتی ہے کہ اس کے وجود کا ایک آخری سبب ہو۔ جب کائنات کے حال کا ایک سبب ہے تو اس کے ماضی کا بھی لازمی طور پر ایک سبب ہونا چاہئے۔ یعنی وہی چیز جس کو علت العلل کہا گیا ہے۔

بے سبب کائنات کو ماننا ممکن نہیں۔ اس لئے لازم ہے کہ ہم اس کا ایک سبب مانیں۔ کائنات لازمی طور پر اپنا ایک آخری سبب چاہتی ہے۔ یہی منطق لازمی قرار دیتی ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ اس لاینحل مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری کوئی بھی تدبیر ممکن نہیں۔ بے سبب خدا کو مان کر ہم اپنے آپ کو بے سبب کائنات کو ماننے کے ناممکن عقیدہ سے بچا لیتے ہیں۔

خدا کو ماننا عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ خدا کو مان کر ہم صرف زیادہ عجیب کے مقابلہ میں کم عجیب کو اختیار کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کا سائنسی ثبوت

اسلام کی تعلیمات کا سائنسی ثبوت دینا، باعتبار حقیقت، ایسا ہی ہے جیسے کسی کے سامنے پیاس کا سائنسی ثبوت دینا یا محبت مادری کو عقلی طور پر ثابت کرنا، حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے۔ اسلام کی تعلیمات فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں، اور جو چیز فطرت کی آواز ہو وہ اپنے آپ انسان کی سمجھ میں آجاتی ہے، اس کے لیے عقلی اور منطقی استدلال کی ضرورت نہیں۔

اسلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ آدمی کی فطرت میں چھپے ہوئے احساسات کو جگائے، وہ اس کے لاشعور کو شعور میں لانے کی کوشش کرے۔ جب اس طرح آدمی کی فطرت جاگ اٹھتی ہے تو آدمی اور اسلام کے درمیان وہی رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو پیاسے آدمی اور پانی کے درمیان ہے۔ اس کے بعد آدمی خود شعور فطرت کے زور پر خدا کے دین کو مان لیتا ہے، وہ اسلام کو اپنی اندرونی آواز کا مثنیٰ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

تاہم جس آدمی کی فطرت ابھی بیدار نہ ہوئی ہو اس کی فطرت کو بیدار کرنے کے لیے عقلی استدلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عقلی استدلال کا ایک اور فائدہ ہے۔ وہ اہل ایمان کے لیے اضافۂ ایمان کا سبب ہے۔ اس سے مومن کو وہ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو قرآن میں اطمینان قلب کہا گیا ہے۔

خدا کا وجود

اسلام کا اساسی عقیدہ خدا کے وجود کو ماننا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جب سائنسی دریافتیں ہوئیں تو قدیم زمانہ کے اکثر عقائد محض توہمات ثابت ہونے لگے۔ اس کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے خدا کو بھی اسی فہرست میں شامل کر دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ خدا کا عقیدہ توہماتی دور کی پیداوار تھا، اب جدید دور میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ مگر یہ اعلان بلا دلیل تھا، حقیقت یہ ہے کہ سائنسی حقائق خدا کے وجود کی مزید تصدیق کر رہے تھے۔ وہ خدا کے عقیدہ کے لیے خالص عقلی بنیاد فراہم کر رہے تھے۔

پہلے زمانہ کی بات ہے۔ ایک بار کچھ لوگوں کے درمیان خدا کے وجود کے بارہ میں بحث چھڑی۔ ایک گروہ کا کہنا تھا کہ خدا ہے۔ دوسرے گروہ کا کہنا تھا کہ خدا نہیں ہے۔ دونوں اپنا اپنا

دعویٰ پیش کر رہے تھے۔ مگر کسی کے حق میں فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ آخر کار ایک تجویز کے مطابق یہ طے ہوا کہ فلاں بزرگ کو بلایا جائے۔ اور ان کے سامنے مسئلہ پیش کیا جائے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کہیں جس سے مسئلہ طے ہو جائے۔

وہ بزرگ ایک مسجد کے حجرہ میں رہتے تھے اور بہت کم باہر نکلتے تھے، ان کو پیغام بھیجا گیا۔ اور درخواست کی گئی کہ آکر بحث کا فیصلہ کریں۔ وہ حجرہ سے نکل کر آئے اور دونوں فریقوں کی باتیں سنیں۔ آخر میں انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور قرآن کی یہ آیت پڑھی: أفي الله شك فاطر السماوات والارض (ابراہیم ۱۰) کیا تم کو اللہ کے بارہ میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا فاطر ہے۔ بزرگ نے یہ آیت پڑھی اور پھر واپس چلے گئے۔

بزرگ نے اس وقت یہ آیت اپنے اعتقادی یقین کے تحت پڑھی تھی۔ مگر آج ہم جانتے ہیں کہ یہ آیت خدا کے وجود کا ایک سائنسی ثبوت ہے۔ بگ بینگ کا جدید نظریہ دراصل اسی آیت کی سائنسی تفسیر ہے۔

قرآن میں اس طرح کی آیت کوئی ایک نہیں ہے۔ بلکہ قرآن میں اس طرح کی بہت سی آیتیں ہیں جو دور جدید میں اپنی معنویت کو ازسرنو واضح کر رہی ہیں۔ یہ قرآن کا ایک انوکھا پہلو ہے۔ کیونکہ دنیا کے وسیع لٹریچر میں، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، کوئی بھی دوسری کتاب ایسی موجود نہیں جس کے لیے جدید دریافت شدہ حقائق اس کی تردید نہ بنیں بلکہ وہ اس کی تفسیر و تشریح بن جائیں۔ قدیم کتابوں میں یہ امتیازی خصوصیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔

قرآن کی یہ صفت دوسری مذہبی کتابوں کے لیے چیلنج نہیں ہے بلکہ وہ ان کے لیے مددگار ہے۔ دوسری مقدس کتابیں مذہب کی علمی اہمیت کو نمایاں کرنے کے لیے کمزور ثابت ہو رہی تھیں۔ یہاں قرآن ان کی مدد کر رہا ہے۔ قرآن دوسری کتابوں میں بیان کی ہوئی سچائیوں کا مصدّق ہے۔ اس اعتبار سے قرآن دوسری کتابوں کا معاون ہے نہ کہ ان کا حریف۔ دیگر اہلِ مذاہب اگر قرآن کو اپنا حریف نہ سمجھیں تو وہ خود اپنے مذہب کے لیے اس کو مددگار پائیں گے۔

مذہب کی طرف

انیسویں صدی مذہب سے انکار کی صدی تھی۔ مگر بیسویں صدی کے آتے ہی تاریخ بدل گئی
موجودہ صدی میں، خاص طور پر، دو واقعات ایسے پیش آئے جس کے بعد مذہب دوبارہ اپنی
پوری طاقت کے ساتھ انسانی زندگی میں واپس آگیا ہے، اگرچہ بالفعل کم، مگر بالقوہ مکمل طور پر۔

۱۔ سائنس سے عدم اطمینان

۲۔ فطرت کی سطح پر مذہبی احساس کا ختم نہ ہونا۔

ایک سو سال پہلے یہ حال تھا کہ سائنس کے خلاف سوچنا بھی جہالت سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹ویں
صدی کے آخر میں ایک مشہور سائنس داں نے کہا تھا کہ میں کسی چیز کو اس وقت تک سمجھ نہیں سکتا
جب تک کہ میں اس کا سائنٹفک ماڈل نہیں بنا لیتا۔ مگر اب، کم از کم علمی سطح پر، سائنس کی افادیت
کے بارے میں انسان کا یہ یقین متزلزل ہو چکا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس سلسلہ میں کافی
لٹریچر شائع ہو چکا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں تاریخ سائنس کا مختصر مقالہ ان الفاظ کے ساتھ
شروع ہوتا ہے:

ابھی حال تک سائنس کی تاریخ فتح کی تاریخ تھی۔ علم کے اضافہ سے سائنس کی کامیابیاں،
توہمات اور ناواقفیت پر سائنس کی فتوحات نے لوگوں کو مسحور کر رکھا تھا۔ سائنس کے ذریعہ
دریافتوں کا سیلاب جاری ہوا جس نے انسانی ترقی کو آگے بڑھایا۔

مگر حال میں یہ محسوس کیا گیا ہے کہ خود سائنس گہرے اخلاقی سوالات سے دوچار رہے ۔
خارجی طاقتیں اور اس کے ترقیاتی عمل کو لاحق ہونے والی رکاوٹیں اور ٹکنالوجی کے لامحدود
استعمال کے خطرات تاریخ دانوں کو چیلنج کر رہے ہیں کہ وہ سائنس کے بارہ میں سابقہ سادہ عقیدہ
کا دوبارہ تنقیدی جائزہ لیں (16/366)

جدید سائنس نے انسان کو بہت سی سہولتیں دی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے انسان کے لئے
اتنا بڑا خطرہ بھی پیدا کر دیا جو اس کے تمام عطیات کو بے معنی قرار دے دیتا ہے۔ یہ تیسری عالمی جنگ کا

خطرہ ہے۔ اگر یہ جنگ چھڑی، تو وہ ایک انتہائی خوفناک جوہری جنگ (nuclear war) ہوگی جو اکثر بڑے شہروں کو چند گھنٹوں کے اندر کھنڈر بنا دے گی۔ مزید یہ کہ اس جنگ کے بعد فضا میں نہایت گہرا دھواں چھا جائے گا جو سورج کی روشنی کو زمین تک پہنچنے نہ دے گا۔ اس طرح ایک ہولناک قسم کا جوہری جاڑا (nuclear winter) شروع ہوگا جو زمین پر نباتات حیوانات اور انسان کو بدترین موت کے کنارے پہنچا دے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

سائنس کے پیدا کردہ مسائل میں سے ایک سنگین مسئلہ وہ ہے جس کو فضائی کثافت (Air Pollution) کہا جاتا ہے۔ سائنس نے ٹکنالوجی پیدا کی۔ ٹکنالوجی نے مشینیں ایجاد کیں۔ ابتداءً جب لوگوں نے سڑکوں پر کاروں کو دوڑتے ہوئے دیکھا اور یہ دیکھا کہ کارخانے ان کے لئے ہر قسم کا سامان تیار کر رہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوگئے۔ مگر جلد ہی انھیں معلوم ہوا کہ یہ ترقی انھیں اس قیمت پر ملی ہے کہ اس نے مضر گیسیں بکھیر کر ہوا کو اس قابل نہیں رکھا کہ انسان اس میں مفید طور پر سانس لے سکے۔ چنانچہ ایک مغربی مفکر نے لکھا ہے کہ موجودہ انسان کو جو سب سے بڑا خطرہ درپیش ہے وہ ہوائی کثافت ہے۔ اس کے الفاظ میں انسانی نسل جس مستقبل کی طرف بڑھ رہی ہے وہ یہ ہے کہ تمام انسان صنعتی تہذیب کے پیدا کردہ کثیف پنجرہ (Polluted cage) میں بند ہو کر رہ جائیں۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۲ جون ۱۹۸۹) میں امریکی حکومت کے شائع کردہ اعداد و شمار کی بنیاد پر بتایا گیا تھا کہ امریکہ کے صنعتی کارخانے ہر سال ۱۶۳ ملین کیلوگرام کے بقدر ایسا دھواں فضا میں انڈیل رہے ہیں جو کینسر پیدا کرنے والا ہے۔ صرف ۳۰ بڑے امریکی کارخانے جو ہوائی کثافت پیدا کر رہے ہیں وہ فی کارخانہ ساڑھے چار لاکھ کیلوگرام سے زیادہ ہے:

US industrial plants are spouting 163 million Kg of suspected cancer-causing chemicals into the air annually, with releases from each of the 30 biggest polluters exceeding 450,000 kilograms, reports AP, quoting government statistics.

امریکہ میں ۱۹۷۰ میں ہوا کی صفائی کا قانون (Clean Air Act) پاس کیا گیا تھا مگر فضائی کثافت میں پچھلے ۲۰ سال میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ امریکہ کے فضائی حفاظت کے ادارہ

(U.S. Environmental Protection Agency) کے مطابق، امریکہ اس وقت ۳۰ ہزار ملین ڈالر سالانہ صرف فضائی کثافت کو کنٹرول کرنے پر خرچ کر رہا ہے۔ مگر موجودہ کوششیں ناکام ثابت ہو رہی ہیں، اس لئے اب تجویز کیا گیا ہے کہ زیادہ موثر ذرائع اختیار کرنے کے لئے اس رقم کو دگنا کر دیا جائے (اسپان، اگست ۱۹۸۹)

سائنس کی ترقی نے صرف مادی مسائل ہی پیدا نہیں کئے بلکہ اسی کے ساتھ نہایت سنگین قسم کے ذہنی اور روحانی مسائل بھی پیدا کر دئے۔

۱۔ سائنس اور سائنسی ذرائع نے انسانی علم کو بے حد وسیع کر دیا تھا۔ اس نے انسان کو نہ صرف خورد بین اور دور بین دی جس سے وہ ان چیزوں کو دیکھ لے جو اب تک دیکھی نہیں جا سکی تھیں۔ بلکہ بے شمار نئے نئے ذرائع انسان پر کھول دئے جس سے ہر میدان میں معلومات کا بے پناہ اضافہ ممکن ہو گیا۔

اس کی وجہ سے انسان کے اندر یہ خود اعتمادی پیدا ہو گئی کہ وہ کسی اور سہارے کے بغیر صرف اپنی سائنس کے ذریعہ آخری حقیقت تک پہنچ سکتا ہے، مگر علم کے اضافے نے انسان کو صرف یہ بتایا کہ وہ لاعلمی کے ایک نئے دور میں داخل ہو گیا ہے۔ ایک سائنس داں کے الفاظ میں، ہم صرف یہ کر رہے ہیں کہ ہم کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جان رہے ہیں:

We are knowing more and more about less and less.

۱۹ ویں صدی کے آخر تک سائنس داں یہ سوچتے تھے کہ وہ علم کے اضافے کے ساتھ آخری حقیقت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ مگر بیسویں صدی کے نصف اول میں جو تحقیقات ہوئی ہیں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان آخری حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان کی محدودیتیں (Limitations) فیصلہ کن طور پر آخری حقیقت تک پہنچنے میں حائل ہیں۔ اہل سائنس کے درمیان اب مسلّمہ طور پر یہ بات مان لی گئی ہے کہ سائنس ہم کو حقیقت کا صرف جزئی علم دیتی ہے:

Science gives us but a partial knowledge of reality.

۲۔ جدید سائنس کے ظہور کے بعد اہل علم کے درمیان یہ ایک فیشن بن گیا تھا کہ کائنات

کی تعبیر خدا کے بغیر کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ہر معاملہ میں ایسی تشریح کرنے کی کوشش کی گئی جس سے یہ ثابت ہو کہ کائنات کے پیچھے کوئی ذہن یا شعور نہیں۔ مگر کائنات کی غیر خدائی تشریح کی ہر کوشش ناکام ہو گئی۔

ہندستان کے مشہور سائنس داں ڈاکٹر سبرامنیم چندر شیکھر جن کو ۱۹۸۳ میں فزکس کا مشترکہ نوبل پرائز ملا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ملحد (atheist) کہتے ہیں۔ انھوں نے اس معاملہ میں سائنس کی موجودہ پوزیشن کا خلاصہ چند لفظوں میں اس طرح بتایا ہے:

> There are aspects which are extremely difficult to understand. A famous remark of Einstein – and other people have said similar things, Schrodinger in particular – that the most incomprehensible thing about nature is that it is comprehensible. How is it that the human mind, extremely small compared to the universe and living over a time span microscopic in terms of astronomical time, comprehend reality in ideas which spring from the human mind? This question has puzzled many people from Kepler on. Why should mathematical description be accurate? Mathematical description is something the human mind has evolved. Why should it fit external nature? We do not have answers to these questions. One is not saying the world is orderly and therefore must be ordered. But why should we understand the world in terms of the concepts we have developed?
>
> The Hindustan Times, May 31, 1987, New Delhi.

کائنات میں ایسے پہلو ہیں جن کا سمجھنا انتہائی حد تک مشکل ہے۔ آئنسٹائن اور دوسرے سائنس دانوں نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ شروڈنگر کے الفاظ میں فطرت کے متعلق سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے۔ ایسا کیوں کر ہے کہ انسانی دماغ جو کائنات کے مقابلہ میں بہت ہی چھوٹا ہے اور فلکیاتی وقت کے مقابلہ میں جس کی مدت بہت ہی کم ہے، وہ حقیقت کو ایسے خیالات کے ذریعہ سمجھتا ہے جو انسانی دماغ کی پیداوار ہیں۔ اس سوال نے کپلر سے لے کر اب تک بہت سے لوگوں کو سراسیمہ کر رکھا ہے۔ کیوں یہ ضروری ہے کہ ریاضیاتی تشریحات بالکل درست ہوں۔ ریاضیاتی تشریح ایک ایسی چیز ہے جس کو انسانی دماغ نے ایجاد کیا ہے۔ پھر کیوں وہ خارجی فطرت کے مطابق ہو جاتی ہے۔ ہم ان سوالات کا جواب نہیں جانتے۔ اس کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا میں نظم ہے اس لئے اس کا کوئی ناظم ہونا چاہئے۔ مگر کیوں ایسا ہے کہ ہم کائنات کو ان اصطلاحوں میں سمجھتے ہیں جن کو ہم نے خود وضع کیا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) نے کہا تھا کہ وہ حکمت کہاں ہے جو ہم نے علم میں کھو دی۔ وہ علم کہاں ہے جس کو ہم نے معلومات میں کھو دیا:

Where is the wisdom that we have lost in knowledge?
Where is the knowledge that we have lost in information?

۱۹۸۹ میں خاص اسی موضوع پر ایک خاتون مصنف کی کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Wisdom, Information and Wonder, by Dr Mary Midgley

ان چیزوں نے ۲۰ ویں صدی کے نصف آخر میں انسان کے اندر نیا ذہن پیدا کیا ہے۔ نہ صرف "آزاد دنیا" میں بلکہ کمیونسٹ ملکوں میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ اس تبدیلی کی خبریں اخبارات میں اور رسائل میں مسلسل دیکھی جا سکتی ہیں۔

امریکہ میں پروفیسر کاکس (Harvey R. Cox) کی ایک کتاب ۱۹۶۵ میں چھپی تھی۔ اس کا نام تھا سیکولر شہر (The Secular City) اس میں مصنف نے دکھایا تھا کہ اب لوگوں نے مذہب میں اپنی دل چسپی کھو دی ہے۔ مگر اسی مصنف کی دوسری کتاب ۱۹۸۴ میں چھپی ہے جس کا نام ہے سیکولر شہر میں مذہب (Religion in the Secular City) یہ دوسری کتاب بتاتی ہے کہ امریکہ (اور اسی طرح دوسرے مغربی ممالک میں) مذہب از سرِ نو زندہ ہو رہا ہے۔

حال میں اس موضوع پر کثرت سے کتابیں شائع ہوئی ہیں، ان کتابوں کا ایک خلاصہ امریکی میگزین اسپان (Span) کے شمارہ دسمبر ۱۹۸۴ میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے مصنف فران شومر (Fran Schumer) ہیں اور اس کا عنوان ہے:

A Return to Religion

اس مضمون کی تفصیل "عقلیات اسلام" میں دیکھی جا سکتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ امریکہ کی نئی نسل محسوس کر رہی ہے کہ مذہب کو چھوڑ کر وہ بے جڑ (Rootless) ہو گئے ہیں۔ چنانچہ وہ از سرِ نو مذہب کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ایک پروفیسر کے الفاظ میں، مذہب دوبارہ ایجنڈا پر ایک مثبت طاقت کے ساتھ واپس آ گیا ہے:

Tradition is back on the agenda
with a positive force (p. 29).

اسلامی دعوت کے مواقع

مذہب کی طرف واپسی دراصل اسلام کی طرف واپسی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج مذہب کا صحیح نمائندہ صرف اسلام ہے۔ جو لوگ فی الواقع مذہب کے طالب ہوں اور وہ اپنی اس طلب میں سنجیدہ ہوں وہ اگر اسلام کو جان لیں تو یقینی طور پر وہ اسلام ہی کو اپنا مذہب بنانے کا فیصلہ کریں گے۔ کیوں کہ وہ "مذہب کے نام سے جس چیز کو تلاش کر رہے ہیں وہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ اس کے دین کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچایا جائے۔ اپنے اس مطلوب کو زیادہ سے زیادہ موثر اور کارگر بنانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو انتظامات کئے ہیں، ان میں سے ایک خاص انتظام یہ ہے کہ اس نے اپنے آخری دین کو مکمل طور پر محفوظ بنا دیا۔ تمام مذاہب میں صرف اسلام کا محفوظ اور تاریخی مذہب ہونا اس کو اجارہ داری کی حد تک واحد قابل اعتماد مذہب بنا دیتا ہے۔

اسلام کی اس خصوصیت نے ایک طرف اسلام کی پیغام رسانی کو نہایت آسان بنا دیا ہے۔ اسلام کے ماننے والے اگر خود اپنی نادانی سے غیر ضروری طور پر کوئی مسئلہ کھڑا نہ کریں تو وہ بلا روک ٹوک اسلام کی تبلیغ کا عمل جاری رکھ سکتے ہیں۔

اسلام کی اس خصوصیت کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ اسلام آج لوگوں کے لئے حد درجہ قابل قبول مذہب بن چکا ہے۔ اب ساری رکاوٹیں ختم کی جا چکی ہیں۔ اب اصل کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کو خالص مثبت انداز میں اسلام سے متعارف کر دیا جائے۔ اس کے بعد لوگ خود اپنے جذبہ کے تحت اس کی طرف کھنچ آئیں گے۔ وہ اس کو خود اپنی طلب کا جواب سمجھ کر اسے اختیار کر لیں گے۔

مذہب کی طرف واپسی، اپنے امکان کے اعتبار سے، اسلام کی طرف واپسی ہے۔ کون ہے جو اس امکان کو واقعہ بنانے کے لئے اٹھے، کون ہے جو خدا کے منصوبہ میں اپنے آپ کو شریک کرے۔
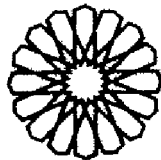
حفاظتی ڈھال

قرآن (الانبیاء ۳۲) میں فرمایا گیا ہے کہ ـــــــ اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا (وجعلنا السماء سقفا محفوظا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان (بالائی فضا) کو اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت و قدرت سے اس طرح بنایا ہے کہ وہ انسان کے لیے ضرر رساں چیزوں سے حفاظت کا ذریعہ بن جائے۔ اس نظام خداوندی کے بے شمار پہلو ہیں۔ تاہم اس کا ایک جزء غالباً وہ فضائی گیس ہے جس کو اوزون (ozone) کہا جاتا ہے۔

سورج ہماری زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے۔ وہ اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کے مادہ کو تقسیم کیا جائے تو اس سے ہماری زمین جیسے بارہ لاکھ کرے بن جائیں گے۔ یہ سورج ہمارے لیے روشنی اور حرارت کا ذریعہ ہے۔ اس سلسلہ میں اس کا موجودہ فاصلہ بے حد اہم ہے، اگر زمین سے سورج کا فاصلہ موجودہ فاصلہ سے کم ہوتا تو اس سے آنے والی روشنی اور حرارت اتنی شدید ہوتی کہ زمین پر کسی ذی حیات کے لیے زندہ رہنا ہی ناممکن ہو جائے۔

سورج کی جو شعاعیں زمین پر آتی ہیں ان میں بعض نہایت مضر اجزاء ہوتے ہیں۔ مثلاً ان آفتابی شعاعوں کا ایک جزء وہ ہے جس کو الٹرا وائیلٹ شعاعیں (ultravioletrays) کہا جاتا ہے۔ یہ شعاعیں ذی حیات مخلوق کے لیے سخت مضر ہیں۔ ان سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور ان کی زیادتی انسان اور حیوان کو ہلاک کرنے کا باعث بن جاتی ہے۔

الٹرا وائیلٹ شعاعیں مسلسل سورج سے نکل کر زمین کی طرف آرہی ہیں۔ اس کے باوجود انسان اور حیوان کیوں زمین پر زندہ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کے اوپر کئی سو میل کی جو فضا (atmosphere) ہے۔ اس کی مختلف تہوں میں سے ایک تہ وہ ہے جو اوزون گیس پر مشتمل ہے۔

یہ اوزون ایک قسم کی آکسیجن گیس ہے۔ اس کے مخصوص مالیکولر ڈھانچہ کی وجہ سے اس میں یہ صفت پیدا ہو گئی ہے کہ وہ اوپر سے آنے والی الٹرا وائیلٹ شعاعوں کو جذب کر لے اور ان کو زمین کی سطح تک پہنچنے نہ دے۔ سائنسی تحقیق کے مطابق، یہی اوزون گیس کی تہ ہے جو انسان کو

الٹراوائیلٹ شعاعوں کے مضر اثرات سے بچائے ہوئے ہے۔

قرآن کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کے اوپر بالائی فضا میں ایک محفوظ چھت قائم کی۔ بالائی فضا (atmosphere) کے بارہ میں موجودہ زمانہ میں جو سائنسی تحقیقات ہوئی ہیں وہ قرآن کے اس بیان کے حق میں ایک علمی تائید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تحقیقات بتاتی ہیں کہ فضا کے اوپر اوزون گیس کی ایک موٹی تہہ ہے جو کرۂ ارض کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ یہ فضائی چھتری انسان کے لیے ایک حفاظتی ڈھال کا کام کر رہی ہے۔ اس حفاظتی ڈھال کے بغیر انسان کے لیے یہ ممکن ہی نہ ہوتا کہ وہ زمین کے اوپر آباد ہو اور یہاں تمدن کی تعمیر کرے۔

تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بالائی فضا میں ۲۰ کیلومیٹر اور ۵۰ کیلومیٹر کی بلندی کے درمیان موجود گیسوں میں قدرتی طور پر ایک ردعمل ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں بننے والے نئے قسم کے مالیکیول سے ایک گیس تیار ہوتی ہے جس کو اوزون کہا جاتا ہے۔ یہ اوزون زمین کے چاروں طرف فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ وہ الٹراوائیلٹ شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح وہ زمین کے اوپر زندگی کے لیے ایک اہم حفاظتی ڈھال کا کام کرتی ہے:

In the region between about 20 and 50 kilometers the monatomic oxygen reacts with 02 to form ozone (03). The resulting worldwide layer of ozone, although its relative concentration is less than 1/10,000, is sufficient to absorb ultraviolet radiation and thereby serve as a vital protective shield for life on earth. (2/322-23)

موجودہ زمانہ میں صنعتی تمدن نے انسان کے لیے جو نئے مسائل پیدا کیے ہیں، ان میں سے ایک خطرناک مسئلہ یہ ہے کہ جدید صنعتوں کی پیدا کردہ بعض گیسوں کی وجہ سے اوزون کی تہہ کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ اب یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ فضا کی اوزون میں رخنہ پڑنے سے، کم از کم جزئی طور پر، الٹراوائیلٹ شعاعوں کو زمین تک پہنچنے کا راستہ مل جائے اور پھر انسان کے لیے طرح طرح کے ناقابل حل مسائل پیدا ہو جائیں۔

موجودہ زمانہ میں اس پر باقاعدہ ریسرچ کی جارہی ہے اور اس سلسلہ میں کافی لٹریچر شائع کیا گیا ہے۔ ٹائم میگزین (۱۷ فروری ۱۹۹۲) نے اس مسئلہ کو اپنی کور اسٹوری بنایا ہے۔ اس کا عنوان

ہے ——— ختم ہوتی ہوئی اوزون ،خطرہ قریب آرہا ہے :

Vanishing ozone: The danger comes closer.

زندگی کے لیے یہ ضروری گیس جس کی بربادی کا مسئلہ پیدا ہوگیا ہے ، وہ آکسیجن کی ایک قسم ہے جس کے مالیکول میں تین ایٹم ہوتے ہیں جب کہ عام آکسیجن کے مالیکول میں دو ایٹم ہوتے ہیں۔ ڈھانچہ میں اس سادہ تبدیلی نے اوزون میں یہ صلاحیت پیدا کردی ہے کہ وہ الٹراوائیلٹ شعاعوں کو جذب کرسکے :

The vital gas being destroyed is a form of oxygen in which the molecules have three atoms instead of the normal two. That simple structure enables ozone to absorb ultraviolet radiation. (p.41)

سائنسی نقطۂ نظر سے مالیکیول کے ایٹمی ڈھانچہ میں یہ تبدیلی ہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر اوزون اس صفت کی حامل گیس بن گئی ہے کہ وہ سورج سے آنے والی مضر گیس کو اپنے اندر جذب کرلے اور اس کو زمین کی سطح تک پہنچنے نہ دے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ بالائی فضا میں اوزون کی یہ گیسی چادر ہم کو مسلسل طور پر الٹراوائیلٹ شعاعوں کے مہلک اثرات سے بچائے ہوئے ہے۔

مگر کوئی عقلی یا سائنسی دلیل یہ ثابت کرنے کے لیے موجود نہیں کہ ایٹم کی تعداد میں تبدیلی بذاتِ خود اپنے اندر اس قسم کی انوکھی اور مفید صلاحیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اس آسمانی آگ سے بچانے والا خدا ہے۔ ظاہری طور پر مذکورہ تبدیلی اس لیے پیدا کی گئی تاکہ آدمی اس کو دیکھ کر ٹھٹکے۔ وہ اس ظاہری واقعہ کو دیکھ کر اندرونی حقیقت تک پہنچ سکے۔

ایک طرف فطرت کے نظام میں اوزون گیس کا ہونا ، دوسری طرف جدید صنعتی نظام کے تحت اوزون گیس کی تباہی ، یہ دونوں واقعات بے حد سبق آموز ہیں ، اور ان میں سوچنے والوں کے لیے عظیم نشانی پائی جاتی ہے۔

بالائی فضا میں اوزون گیس کی موٹی تہ کا پایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ جس ہستی نے دنیا کا نظام بنایا ، اس کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ زمین پر بسنے والے انسانوں کی کیا ضرورتیں ہوں گی۔ اس نے تجربہ سے پہلے یہ جانا کہ سورج کی شعاعوں میں افادیت کے ساتھ نقصان کے پہلو بھی موجود ہیں۔ اس نے افادیت کے پہلو کو مستحکم کیا اور نقصان والے پہلو سے بچاؤ کا انتظام کردیا تاکہ انسان جب زمین پر بسے تو وہ سورج کی نقصان دہ شعاعوں سے محفوظ رہے ، سورج کی صرف

مفید شعاعیں انسانوں تک پہنچ سکیں۔

اب دوسرے رخ کو دیکھئے جو بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہمارے سامنے آیا ہے۔انسان نے ساٹھ سال پہلے وہ چیز دریافت کی جس کو ایرکنڈیشننگ کہا جاتا ہے۔اس دریافت نے انسان کو غیر معمولی طور پر راحت کا سامان دیا۔ایرکنڈیشنڈ مکان اور دفاتر اور مختلف بلڈنگیں ماڈرن زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ جب یہ صنعت دریافت ہوئی تو وہ خیر ہی خیر نظر آتی تھی ،مگر جدید تحقیقات نے بتایا کہ اس خیر میں شر بھی چھپا ہوا ہے۔

موجودہ ایرکنڈیشننگ کا سسٹم سی ایف سی پر مبنی سسٹم (cfc-based system) ہے۔ سی ایف سی ٹکنالوجی آج انسان کے لیے زبردست خطرہ بن گئی ہے۔سی ایف سے مراد کلورو فلورو کاربن (chlorofluorocarbons) ہے۔ یہ ایک کیمیکل ہے جو ایرکنڈیشننگ کے سامانوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے۔اس کیمیکل کو تیار کرنے کے لیے جو کارخانے بنائے گئے ہیں وہ اس کی تیاری کے دوران ایک ضمنی پیداوار (by-product) تیار کرتے ہیں جس کو سی آئی او یا کلورین مونوآکسائڈ (chlorine monoxide) کہا جاتا ہے۔یہی سی آئی او کا مادہ ہے جو دراصل اوزون کی تہ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔حتی کہ اس نے بالائی فضا میں ایک بڑا سوراخ پیدا کر دیا ہے جس سے سورج کی مذکورہ مضر شعاعیں زمین پر آنا شروع ہو گئی ہیں۔

اب امریکہ وغیرہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ریسرچ ہو رہی ہے تاکہ کوئی ایسا متبادل مادہ دریافت کیا جائے جس کے ذریعہ مذکورہ مضر کیمیکل پیدا کیے بغیر ایرکنڈیشننگ کے سامان بنائے جاسکیں۔

اب یہاں دو نمونے ہیں۔ایک فطرت (نیچر) کا۔ دوسرے انسانی صنعت کا۔ فطرت کا نمونہ بتاتا ہے کہ اس میں پیشگی طور پر یہ انتظام موجود تھا کہ سورج کی مضر شعاعیں زمین کی سطح تک نہ پہنچیں۔تاکہ انسان محفوظ طور پر زمین پر آباد ہو سکے۔ دوسری طرف صنعتی دور کے صنعت کاروں کو پیشگی طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان کی ایرکنڈیشننگ کی صنعت فطرت کے قیمتی توازن کو توڑ دے گی اور انسان کے لیے سخت ناموافق صورت حال پیدا ہو جائے گی۔

یہ صورت حال اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کی تخلیق اور اس کی منصوبہ بندی کے پیچھے ایک بالاتر خدائی ذہن کی کارفرمائی ہے۔اگر یہاں ایسے ذہن کی کارفرمائی نہ ہوتی تو فطرت کے نظام میں

بھی بار بار اسی قسم کے خلا اور نقائص ظاہر ہوتے جو انسانی صنعت میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے : بڑا بابرکت ہے وہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تم کو جانچے کہ تم میں سے کون اچھا کام کرتا ہے۔ اور وہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے۔ جس نے بنائے سات آسمان اوپر تلے۔ تم رحمٰن کے بنانے میں کوئی خلل نہیں دیکھو گے۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو، کہیں تم کو کوئی خلل نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھو۔ نگاہ ناکام تھک کر تمہاری طرف واپس آجائے گی (الملک ۱-۴)

خلاصہ کلام

اللہ تعالیٰ نے سورج پیدا کیا، سورج کی پیدائش زمین پر انسان کی آبادی سے بہت پہلے ہوئی۔ مگر اللہ تعالیٰ کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ سورج کی شعاعوں کا ایک جزء (الٹراوائیلٹ) انسان کے لیے مضر ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر بالائی فضا میں ایک محکم حفاظتی انتظام کر دیا جو انسان کو اس مضر شعاع سے بچاتا رہے۔

دوسری طرف انسانی انجینیروں اور سائنس دانوں نے زمین پر ایک انڈسٹری قائم کی۔ اس انڈسٹری سے ایک ایسی گیس نکلنے والی تھی جو فضا میں بلند ہو کر اس حفاظتی انتظام میں رخنہ پیدا کر دے جو انسان کو مضر آفتابی شعاعوں سے بچانے کے لیے کیا گیا ہے۔ مگر انسانی ماہرین کو اس کا علم صرف اس وقت ہوا جب کہ ان کی انڈسٹری کے یہ مضر نتائج عملاً ظہور میں آ گئے اور انسان ان کا شکار ہونے لگا۔

یہ تقابلی مثال بتاتی ہے کہ کائنات کی تخلیق نہ صرف یہ کہ ذہن کے بغیر نہیں ہو سکتی، بلکہ انسان جیسی ذہانت بھی اس عمل تخلیق کے لیے ناکافی ہے۔ اس کے لیے مافوق ذہانت (سپر ذہانت) درکار ہے۔ اس قسم کے اعلیٰ ذہن کے بغیر موجودہ بامعنی کائنات کبھی وجود میں نہیں آ سکتی۔

دینِ خداوندی کی تصدیق

جدید فکری انقلاب اسلام کے حق میں ایک تصدیقی انقلاب ہے۔ اس انقلاب کے بعد جو تصدیقی حقیقتیں سامنے آئی ہیں وہ بے شمار ہیں۔ صرف مثال کے طور پر یہاں ہم بعض اصولی چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

۱۔ کائنات کی اشیاء بظاہر مختلف اور متعدد دکھائی دیتی ہیں۔ قدیم زمانہ میں اس ظاہری مشاہدہ کی بنا پر ان کو الگ الگ سمجھ لیا گیا۔ اس تعدد اشیاء سے تعدد آلہہ کا عقیدہ پیدا ہوا مگر موجودہ زمانہ میں سائنسی مطالعہ نے بتایا کہ تمام چیزیں، اپنے ظاہری اختلافات کے باوجود، ایک جوہر سے بنی ہوئی ہیں۔ قدیم عقیدہ کے مطابق، کائنات بظاہر شرک کی تصدیق کرتی ہوئی دکھائی دیتی تھی، جدید تحقیق کے بعد کائنات توحید کی مصدق اور مؤید بن گئی۔

۲۔ اسلام کے عقائد سب کے سب غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان پر صرف بالواسطہ یا استنباطی دلیل ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ مثلاً خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لیے یہ دلیل کہ ڈزائن ہے تو اس کا ڈزائنر بھی لازماً ہونا چاہیے۔ یہ اسلوب استدلال فلسفیانہ ذہنوں کو اپیل نہیں کرتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ براہ راست دلیل لاؤ، اس کے بعد ہم تمہاری بات کو مانیں گے۔ جدید تحقیقات نے ثابت کر دیا کہ موجودہ دنیا میں صرف بالواسطہ استدلال ہی ممکن ہے۔ مذہبی معتقدات کے علاوہ خالص سائنٹفک حقیقتوں پر بھی صرف بالواسطہ دلیل ہی قائم کی جاسکتی ہے۔ اس تحقیق کے بعد دینی علم کلام عین سائنسی علم کلام بن گیا۔

۳۔ انسان یہ سمجھے ہوئے تھا کہ وہ موجودہ دنیا ہی میں اپنی مادی جنت بنا سکتا ہے۔ وہ مسلسل مادی چیزوں کے حصول میں لگا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جب وہ مادی ترقی کے آخر میں پہنچے گا تو اس کی جنت بھی اسی دنیا میں تعمیر ہو چکی ہوگی۔ موجودہ زمانہ میں یہ مادی ترقیاں اپنی آخری حد تک پہنچ گئیں۔ مگر مادی ترقیاں انسان کے لیے جنت کی تعمیر نہ کرسکیں۔ اب یہ معلوم ہوا کہ مادی ترقی جتنا بڑھتی ہے اتنا ہی وہ مسائل میں اضافہ کرتی چلی جاتی ہیں۔ وہ انسان کی امیدوں کو پورا نہیں کرتی۔ یہ واقعہ اس بات کا ایک تجرباتی قرینہ بن گیا کہ جنت کا حصول صرف اگلے دور حیات میں ممکن

ہے، موجودہ دورِ حیات میں جنت کا حصول ممکن نہیں۔

۴۔ قدیم زمانہ میں مذہب کو مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اس کو عقیدت مندی کے سوا کسی اور نظر سے دیکھنا ممکن نہ تھا۔ یہ مزاج مذہب کے تنقیدی مطالعہ کی راہ میں حائل تھا۔ یہ مذاہب تحریف کے نتیجہ میں غیر معتبر ہو چکے تھے۔ مگر تقدیسی مزاج کی وجہ سے ان کی جانچ نہیں کی جاتی تھی۔ اس بنا پر ان مذاہب کی بے اعتباریت چھپی ہوئی تھی۔

جدید مغربی انقلاب، جو اسلامی انقلاب کے اثر سے پیدا ہوا، اس نے اشیاء کے تقدس کو ختم کر دیا۔ اب ہر چیز کے بارہ میں تحقیق و تفتیش ہونے لگی۔ تحقیق و تفتیش کا یہ سلسلہ ابتداءً عالم طبیعی سے شروع ہوا۔ اس کے بعد بڑھتے بڑھتے وہ مذہب تک پہنچ گیا۔ مذاہب کو تاریخی اور علمی اعتبار سے جانچا جانے لگا۔

اس جانچ کے نتیجہ میں وہ چیز سامنے آگئی جو اب تک چھپی ہوئی تھی۔ یعنی مذاہب کا غیر معتبر ہونا۔ مثال کے طور پر اس جانچ کے نتیجہ میں یہ حقیقت کھلی کہ یہ تمام مذاہب اپنی کوئی تاریخی بنیاد نہیں رکھتے۔ یہ مذاہب جن شخصیتوں کی طرف منسوب ہیں، وہ تمام شخصیتیں صرف مذہبی عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کو تاریخی شخصیت کا درجہ حاصل نہیں۔ مثلاً عراق کے تاریخی ریکارڈ میں حضرت ابراہیم کا کوئی ذکر نہیں۔ مصر کے تاریخی ریکارڈ میں حضرت موسیٰ کا کوئی ذکر نہیں۔ فلسطین کے تاریخی ریکارڈ میں حضرت مسیح کا کوئی ذکر نہیں۔ اس معاملہ میں صرف ایک استثناء ہے، اور وہ پیغمبر اسلام ؐ کا ہے۔

حضرت مسیح، پیغمبر اسلام سے پہلے کے نبیوں میں سب سے آخری نبی ہیں۔ مگر ان کا ذکر بھی تاریخی ریکارڈ میں موجود نہیں۔ مسیح کے نام سے جس ہستی کو جانا جاتا ہے وہ صرف "اعتقادی مسیح" ہیں، تاریخی مسیح (historical Jesus) کا خالص علمی اعتبار سے کوئی وجود نہیں۔ اس سلسلہ میں کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ مذہب کا مطالعہ (Study of Religion) میں اقرار کیا گیا ہے کہ مسیح کی قدیم شہادتوں کے بارہ میں تاریخی تیقن حاصل کرنا ممکن نہیں:

historical certainty about much in the ancient witnesses to Jesus is impossible (15/624). (W.C.R.L)

۵۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان میں اللہ کی آیات (نشانیاں) ہیں، ان پر غور کرو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موجودہ کائنات کو اس انداز پر بنایا ہے کہ یہاں ہر چیز میں بے شمار ایسے پہلو چھپے ہوئے ہیں جو توحید اور حقائق الٰہی کی طرف اشارہ کرنے والے ہیں۔ جو دین خداوندی کے حق میں برہان ہیں اور اسی کے ساتھ ان میں مومن بندوں کے لیے ازدیاد ایمان کا سامان چھپا ہوا ہے۔

مگر قدیم زمانہ میں کائنات کے یہ ربانی اسرار چھپے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اسرار اس وقت کھلتے ہیں جب کہ ان پر آزادانہ غور کیا جائے۔ جب گہرائی کے ساتھ ان کی تحقیق کی جائے۔ مگر شرک اس قسم کی تحقیق و جستجو میں مانع تھا۔ شرک دراصل نام ہے مظاہر فطرت کی پرستش کا۔ مشرکانہ توہمات کے تحت انسان فطرت کے ان مظاہر کو پرستش کا موضوع بنائے ہوئے تھا۔ اور جس چیز کو انسان پرستش کا موضوع بنالے وہ اس کی نظر میں مقدس بن جاتی ہے۔ اس کے لیے صرف عقیدت مندانہ طور پر جھکنے کا مزاج بنتا ہے نہ کہ علمی انداز میں ان کی تحقیق و تفحص کا مزاج۔

یہ مشرکانہ ذہن اور یہ توہماتی مزاج اسرار فطرت کو کھولنے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ اور اسرار فطرت کے نہ کھلنے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہو رہا تھا کہ خدا کے دین کے حق میں کائنات کی علمی تصدیقات مبرہن ہو کر لوگوں کے سامنے آئیں۔ اسلام کے دور اول میں جو وسیع انقلاب لایا گیا، اس نے مذکورہ مشرکانہ ذہن کے غلبہ کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ کائنات کی چیزوں کا تقدس ذہنوں سے نکل گیا۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جن مظاہر فطرت کو لوگ صرف تقدس اور پرستش کی نظر سے دیکھتے تھے، اب وہ ان کو تجسس اور تحقیق کی نظر سے دیکھنے لگے۔

اس طرح تاریخ انسانی میں ایک نیا علمی دور شروع ہوا۔ ابتداءً اس فکر کا مرکز مکہ تھا۔ پھر وہ مدینہ پہنچا۔ اس کے بعد وہ دمشق ہوتا ہوا بغداد پہنچا۔ اس کے بعد مزید آگے بڑھ کر وہ اسپین اور سسلی میں داخل ہوا۔ اس کے بعد اٹلی اور فرانس پہنچ کر وہ مغربی یورپ میں پھیل گیا۔ اس طرح یہ انقلابی فکر مسلسل سفر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس مرحلہ کو پہنچ گیا جس کو موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کہا جاتا ہے۔

اس انقلاب کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ اللہ کی جو نشانیاں فطرت کے اندر چھپی ہوئی تھیں وہ

ظاہر ہو گئیں۔ اس نے دین خداوندی کے حق میں دلائل و حقائق کی نئی دنیا کھول دی جس کا سلسلہ برابر جاری ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔

ورلڈ کونسل آن ریلیجس لبرٹی (W.C.R.L.) کا صدر دفتر نیویارک میں ہے۔ دسمبر ۱۹۸۶ میں اس کا ایک انٹرنیشنل اجتماع جنیوا میں ہوا۔ اس موقع پر تنظیم کے صدر ڈاکٹر جوزف نے تقریر کرتے ہوئے بتایا کہ ہم کئی سال سے کام کر رہے ہیں۔ اس دوران ہم نے اپنے مشن کے تحت بہت سا لٹریچر چھاپا ہے اور بہت سے اجتماعات کیے ہیں۔ مگر ہم کو سب سے زیادہ خط اور تار اور ٹیلی فون جس چیز پر ملے، وہ صرف ایک چھوٹا سا جملہ تھا۔ یہ جملہ میں نے اپنی تقریر میں ایک بار کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ :

Atheistic communism is the number one enemy of religious liberty.

ملحد اشتراکیت مذہبی آزادی کی دشمن نمبر ایک ہے (الرسالہ مارچ ۱۹۸۷، صفحہ ۲۹)

یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں کمیونزم فکری اور عملی حیثیت سے مذہب دشمنی کا چیمپین بنا رہا۔ زمین کے ایک بڑے رقبہ پر کمیونسٹ حکومت قائم کر کے تقریباً ۷۵ سال تک اس نے مذہب کے ہر نشان کو مٹانے کی کوشش کی۔ تعلیمی ادارے، پریس، ریڈیو، ٹی وی ہر چیز کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا کہ مذہب کو زمین سے لے کر انسانی دل و دماغ تک ہر جگہ ختم کیا جائے۔ مگر ۱۹۹۱ میں کمیونسٹ ایمپائر ٹوٹ پھوٹ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی اور اس کی تمام سرگرمیاں خود سوویت یونین میں خلاف قانون قرار دے دی گئیں۔ گورباچیف اور یلتسین کی قیادت کے تحت کمیونسٹ روس میں جابرانہ نظام کے بجائے آزادانہ نظام قائم کر دیا گیا۔

جولائی ۱۹۹۰ میں میں نے سوویت روس کا سفر کیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ گورباچیف کی نئی پالیسی کے تحت اچانک مذہب زندہ ہو گیا ہے۔ مذہبی سرگرمیاں دوبارہ جاری ہو گئی ہیں۔ اس کو دیکھ کر میں نے اپنے گائڈ سے کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ یہاں مذہب بڑی تیزی سے زندہ ہو گیا ہے۔ اس نے کہا : مذہب مرا کب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ قدیم جبر کے زمانہ میں بیرونی سرگرمیوں میں اگرچہ مذہب غائب ہو گیا تھا۔ لیکن گھریلو سطح پر وہ بدستور زندہ تھا۔ چنانچہ آزادی ملتے ہی وہ فوراً زندہ ہو گیا۔

کمیونسٹ اقتدار کے ۷۵ سال مذہب کے لیے بڑے سخت سال تھے۔ مگر اس تجربہ کا یہ عظیم فائدہ ہوا کہ اس نے ایک حقیقت کو نہایت اعلیٰ سطح پر ثابت کر دیا ہے۔ آج کمیونسٹ روس میں کمیونزم کے ہر نشان کو مٹایا جا رہا ہے۔ عوام آخری حد تک کمیونزم سے متنفر ہو گئے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیونسٹ نظام نے ان کے اوپر وحشیانہ مظالم کیے۔ دوسری طرف اسی ملک میں (اور دوسرے ملکوں میں بھی) مذہب کی بنیاد پر لوگوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس ظلم کی بنا پر لوگوں نے کمیونزم کو تو چھوڑ دیا۔ مگر اسی طرح کے ظلم کے باوجود وہ مذہب کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کمیونزم محض ایک خارجی آئیڈیالوجی تھی۔ جب کہ مذہب کا نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کی جڑیں فطرت انسانی میں نہایت گہرائی کے ساتھ پیوست ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشکلات پڑنے پر لوگ کمیونزم کو چھوڑ دیتے ہیں مگر مشکلات کے باوجود وہ مذہب کو نہیں چھوڑ پاتے۔ جو چیز خود آدمی کی اندرونی فطرت کی آواز ہو اس کو چھوڑنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

چند مزید حقیقتیں

بدھزم ایک قدیم مذہب ہے جو پانچویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوا۔ اس کو بے خدا مذہب (Godless Religion) کہا جاتا ہے کیوں کہ اس میں خدا کے مستقل وجود کا کوئی تصور نہیں۔ مگر اس قسم کا مذہب بیک وقت انسانی فطرت کے خلاف بھی ہے اور علم کے خلاف بھی۔

انسانی فطرت عین اپنے پیدائشی رجحان کے مطابق ایک برتر خدا چاہتی ہے۔ کمیونسٹ روس میں ۷۵ سال تک بے خدا انسان بنانے کی کوشش کی گئی۔ مگر آخر کار خود کمیونسٹ نظام ٹوٹ گیا مگر انسانی فطرت بدل نہ سکی۔ خالص کمیونسٹ سماج میں تربیت پایا ہوا ایک نوجوان پائلٹ کا جہاز جب حادثہ کا شکار ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کا بلیک باکس بجایا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرنے سے پہلے کمیونسٹ پائلٹ کی زبان سے جو آخری لفظ نکلا وہ یہ تھا کہ : پطرس مجھے بچا :

Peter save us

اسی طرح سائنس کا پورا مطالعہ علم انسانی کو جس طرف لے جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی تخلیق کے پیچھے ایک با ارادہ ذہن ہے۔ تقریباً تمام سائنس داں جو کائنات کا مطالعہ کرتے ہیں

وہ کسی نہ کسی طور پر خالق کا وجود ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور نظریاتی سائنس داں اسٹیفن ہاکنگ (Stephen W. Hawking) نے اپنی کتاب اے بریف ہسٹری آف ٹائم (۱۹۸۹) میں کائناتی شواہد کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی توجیہہ کرنا بے حد مشکل ہوگا کہ کائنات کیوں اس خاص ڈھنگ پر شروع ہوئی سوا اس کے کہ اس کو ایک خدا کا عمل مانا جائے جس نے چاہا کہ ہماری جیسی ہستیاں پیدا کرے :

It would be very difficult to explain why the universe should have begun in just this way, except as the act of a God who intended to create beings like us (p. 134).

بدھزم کا جو شخص مطالعہ کرتا ہے وہ اس کے عقیدہ کو علم اور فطرت دونوں کے غیر مطابق محسوس کرتا ہے۔ دوسری طرف اسلام میں واضح طور پر ایک عظیم خدا کا تصور موجود ہے۔ اس طرح بدھزم انسانی طلب کے غیر مطابق ہے اور اسلام انسانی طلب کے عین مطابق۔

مسیحیت دو ہزار سال پہلے پیدا ہوئی۔ تاہم اپنی موجودہ شکل میں وہ انسان کو مطمئن نہیں کرسکتی۔ موجودہ مسیحیت میں خدا کا تصور یہ دیا گیا ہے کہ وہ بیک وقت ایک بھی ہے اور عین اُسی وقت وہ تین بھی ہے۔ اس عقیدہ کو تثلیث (Trinity) کہا جاتا ہے۔ مگر کوئی بھی ذی ہوش آدمی اس قسم کے ناقابلِ فہم حساب کو ماننے پر راضی نہیں ہوسکتا۔

موجودہ مسیحی مذہب میں حضرت مسیح کا تعارف خدا کے بیٹے کی حیثیت سے کرایا جاتا ہے۔ یہ بیٹا خدا سے الگ نہیں۔ وہ بیٹا ہوتے ہوئے عین اسی وقت خدا بھی ہے۔ مزید یہ کہ مسیحی عقیدہ کے مطابق یروشلم میں حضرت مسیح کو نعوذ باللہ سولی دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ چنانچہ ہر چرچ میں ان کے خون آلود جسم کی بڑی بڑی تصویریں خاص اہتمام کے ساتھ نصب کی جاتی ہیں۔

اب ایک سائنس داں جو کائنات کا مطالعہ کرتا ہے وہ پاتا ہے کہ کائنات بے پایاں حد تک عظیم ہے۔ سائنس داں کا ذہن کہتا ہے کہ جو کائنات اس قدر ناقابلِ فہم حد تک عظیم ہے، اس کے خدا کو بھی یقیناً انتہائی غیر معمولی حد تک عظیم وکبیر ہونا چاہیے۔ مگر وہ دیکھتا ہے کہ چرچ میں جس خدا کا تعارف کرایا جاتا ہے اس کو رومی حکمرانوں نے بے بسی کے ساتھ سولی پر چڑھا کر ہلاک کر دیا۔ خالق کی یہ تصویر اس کی تخلیق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔ اس لیے وہ اس کو ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

مسیحیت اپنے موجودہ عقائد کے اعتبار سے انسان کی عقل اور اس کی فطرت کو اپیل نہیں کرتی۔ جب کہ اسلام کی تعلیمات انسانی فطرت اور انسانی عقل کے عین مطابق ہیں۔

یہودیت کی کتاب "پرانا عہدنامہ" ہے۔ مگر پرانا عہدنامہ ایسی باتوں سے بھرا ہوا ہے جو اس کو کتاب مقدس سمجھنے میں شدید طور پر مانع ہیں۔ مثال کے طور پر پیغمبر وہ مقدس لوگ ہیں جو خدا کی طرف سے انسانی کو سچائی کا پیغام دیتے ہیں۔ مگر پرانا عہدنامہ (بائبل) میں پیغمبروں کی طرف نہایت لغو باتیں منسوب کر دی گئی ہیں۔ مثلاً پیغمبر کا شراب پینا، پیغمبر کا اپنی بیٹیوں کے ساتھ ناجائز فعل کرنا، پیغمبر کا جھوٹ بولنا، وغیرہ۔

بائبل اپنی موجودہ صورت میں انسان کو مقدس کتاب نظر نہیں آتی اور نہ پیغمبر وہ افراد نظر آتے ہیں جنھیں خدا نے اپنی نمائندگی کے لیے چنا ہو۔ اس کے برعکس قرآن میں پیغمبروں کو نہایت پاکیزہ کردار اور اعلیٰ اخلاق کے حامل انسان کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق پیغمبر واقعۃً اس قابل نظر آتے ہیں کہ خدا انھیں اپنے پیغام کی پیغام رسانی کے لیے چنے۔

اب ہندوازم کو لیجئے۔ ہندوازم میں انسان کو چار ذاتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ چاروں الگ الگ پیدا کیے گئے۔ ان میں کوئی اونچی ذات ہے اور کوئی نیچی ذات۔

قدیم توہماتی دور میں انسان اس قسم کے عقیدہ کو مان سکتا تھا۔ مگر جدید انسان کے لیے اس قسم کے عقیدہ کو ماننا بالکل ناممکن ہے۔ اولاً، یہ عقیدہ مساوات انسانی کے تصور کے خلاف ہے۔ اولاً انسانی فطرت کہتی ہے کہ سب انسانوں کو برابر کا درجہ ملنا چاہیے۔ رنگ و نسل کی بنا پر ان میں تفریق کرنا انسانی تقاضے کے مطابق نہیں۔

موجودہ زمانہ میں یہ نظریہ سائنس کی تحقیقات سے بھی ٹکرا گیا ہے۔ کیوں کہ جدید تحقیقات بتاتی ہیں کہ تمام انسان ایک ہی فرد کی نسل سے ہیں اور سب کے سب حیاتیاتی بھائی (biological brothers) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کے بارہ میں چار الگ الگ پیدائش کا نظریہ موجودہ زمانہ میں غیر معتبر نظریہ بن کر رہ گیا ہے۔

مگر اسلام میں اس قسم کا کوئی تضاد نہیں۔ اسلام میں واضح طور پر تمام انسانوں کو یکساں درجہ دیا گیا ہے۔ "تقویٰ" کے سوا کسی اور بنیاد پر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان فرق کرنا جائز

نہیں۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ سن لو، تم سب لوگ آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے۔

آج کی دنیا میں مسلمان خوف اور اندیشہ کی کیفیت میں کھڑا ہوا ہے۔ اس کو نظر آتا ہے کہ دوسری قومیں اس کے چاروں طرف سازشوں اور عداوتوں کا جال پھیلائے ہوئے ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لیے یہ مایوسی کا وقت نہیں بلکہ یقین اور امید کا وقت ہے۔ اگر وہ اپنے ذہن کو خارجی خطروں سے ہٹا کر قرآن کی طرف متوجہ ہو جائیں تو وہ سنیں گے کہ رب العالمین دوبارہ انھیں یہ آواز دے رہا ہے کہ میرے بندو، ڈرو نہیں۔ تمہارے پاس دین حق کی صورت میں جو نظریاتی سپر پاور ہے اس کو استعمال کرو۔ اور اس کے بعد تم دیکھو گے کہ تمام لوگوں کے ساحرانہ منصوبے باطل ہو گئے۔ حتیٰ کہ جو لوگ بظاہر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن نظر آ رہے تھے، وہ ایک نئے فکری انقلاب سے دوچار ہو کر اسلام اور مسلمانوں کے دوست بن گئے ہیں۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

اسلام عصر حاضر میں

ٹائم میگزین نے اپنے شمارہ ۱۵ جون ۱۹۹۲ میں اسلام کو اپنی کور اسٹوری بنایا ہے۔ اس کے صفحہ اول کی سرخی یہ ہے ـــــ اسلام، کیا دنیا کو اس سے ڈرنا چاہئے :

Islam: should the world be afraid?

میگزین کے اندر صفحہ ۲۰ پر اس کی دوسری سرخی کے الفاظ یہ ہیں ـــــ اسلام کی تلوار

(The sword of Islam)

ٹائم کے ان مضامین میں اسلام کی جنگ جویانہ تصویر کوئی استثنائی واقعہ نہیں۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے بارہ میں عام طور پر اسی قسم کی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ یورپ کے ایک سفر میں میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ اس نے اپنا قصہ بتایا۔ اس کو ایک جاب کے لئے انٹرویو دینا تھا۔ جو پروفیسر اس کا انٹرویو لے رہا تھا، نوجوان کے بیان کے مطابق، اس کے اور نوجوان کے درمیان گفت گو کا ایک حصہ یہ تھا ـــــ کیا تم مسلمان ہو۔ ہاں۔ پھر تو تم دہشت گرد ہو :

Are you a Muslim?
Yes.
Then you are a terrorist.

یہ چند واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی تصویر کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کی تصویر ایک تشدد پسند مذہب کی تصویر بن گئی ہے۔ اس بنا پر کچھ لوگ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اسلام عالمی امن، ہم وجودیت (co-existence) اور باہمی اتحاد (solidarity) کے لئے مستقل خطرہ ہے۔ مگر یہ سراسر غلط فہمی ہے۔ اس کا اصل صورت حال سے کوئی تعلق نہیں۔

اس معاملہ میں اسلام کی حیثیت متعین کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام کا مقصد کیا ہے۔ وہ کون سا نشانہ ہے جس کو اسلام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ نشانہ نہایت واضح طور پر قرآن کی اس آیت میں ملتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو تم لوگ ربانی بن جاؤ (۳ : ۷۹)

قرآن میں یہاں ربانی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی کسی اور والے انسان نہ بن کر رب والے انسان بن جاؤ) تمہاری عبادت، تمہارا اڈیوشن، تمہاری محبت اور خوف سب ایک اللہ کے لئے

ہوجائے۔

اس قسم کا انسان بنانا ہی اسلام کا اصل مقصد ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا انسان تشدد اور جنگ کے ذریعہ نہیں بن سکتا۔ یہ مکمل طور پر ایک ذہنی انقلاب اور قلب کی تبدیلی کی بات ہے۔ اور ذہن کا انقلاب اور قلب کی تبدیلی نصیحت اور دعوت کے ذریعہ سے آتی ہے نہ کہ تشدد اور جنگ کے ذریعہ سے۔

اگر یہ کہا جائے کہ "جنگ جو تاجر یا تشدد پسند تاجر تو یہ ایک متناقض (self-contradictory) اصطلاح ہوگی۔ کیوں کہ کوئی سچا تاجر کبھی جنگجو اور تشدد پسند نہیں ہو سکتا۔ تجارت عین اپنی فطرت کے مطابق آدمی کو امن پسند اور صلح جو بناتی ہے۔ یہی معاملہ اسلام کا بھی ہے۔ اسلام اپنی فطرت کے اعتبار سے مکمل طور پر امن پسند اور صلح پسند ہے۔ اسلام کی دعوت کا کام صرف پر امن حالات میں ہو سکتا ہے۔ جنگ اور تشدد کے حالات میں اسلام کی دعوت کا کام نہیں ہو سکتا۔ پھر اسلام کیوں کر جنگ اور تشدد کو پسند کر سکتا ہے۔

جب اسلام ایک امن پسند مذہب ہے تو اس کی یہ برعکس تصویر کیسے بنی کہ وہ تشدد پسند ہے۔ اس کا ایک سبب ماضی میں ہے، اور دوسرا سبب حال میں۔ ماضی کا سبب وہ جنگیں ہیں جو رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں پیش آئیں۔

بطور واقعہ یہ درست ہے کہ اس زمانہ میں غیر مسلم قوموں سے کچھ جنگیں پیش آئیں۔ مگر ان جنگوں کا پیش آنا خود اسلام کے اپنے اصول کی بنا پر نہ تھا۔ بلکہ اس وقت کی دنیا کے خارجی حالات کی بنا پر تھا۔ یہ جنگیں اس لئے پیش نہیں آئیں کہ اسلام خود لڑنا چاہتا تھا۔ بلکہ وہ اس لئے پیش آئیں کہ دوسرے لوگوں نے لڑائی چھیڑ کر اسلام کو مجبور کر دیا کہ وہ ان سے لڑے۔

اسلام کا ظہور ڈیڑھ ہزار سال پہلے کے زمانی حالات میں ہوا۔ اس زمانہ کے بارہ میں تاریخ کا مطالعہ بلا اختلاف بتاتا ہے کہ وہ مذہبی تعذیب (Religious persecution) کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کا انسان عام طور پر اپنے مذہب کے سوا ہر دوسرے مذہب پر ظلم کرنے کو اپنا فطری حق سمجھتا تھا۔

چنانچہ اس زمانہ میں ہر مذہب کو دوسرے مذہب والوں کی طرف سے تشدد کا تجربہ پیش آتا تھا۔ مثال کے طور پر مسیحیت اپنی پیدائش کے بعد تقریباً ڈیڑھ ہزار سال تک اکثر تعذیب

(persecution) کا شکار رہی۔ ہر جگہ اس کے افراد کو ستایا جاتا رہا۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں وہی مسیحیت ساری دنیا میں اپنے عقیدہ کی کھلی تبلیغ کر رہی ہے اور اس کو کوئی ستانے والا نہیں۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ قدیم مسیحیت میں کوئی سیاسی بغاوت یا جنگی کارروائی کا نظریہ موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو عقیدہ آج مسیحیت کا ہے اس کا وہی عقیدہ پہلے بھی تھا۔ خارجی دنیا کی طرف سے سلوک میں فرق کا سبب تمام تر زمانہ کا فرق (age-factor) ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تعذیب کا زمانہ تھا۔ اس لئے قدیم زمانہ میں مسیحیت کو ستایا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے۔ اس لئے آج مسیحیت کے ساتھ کہیں تعذیب کا سلوک نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کو آزادانہ ماحول میں کام کا موقع مل رہا ہے۔

اسلام کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قدیم زمانہ میں اسلام کے ساتھ جنگ کے جو واقعات پیش آئے، اس کا اصل سبب زمانی حالات تھے نہ کہ خود اسلام کی تعلیم۔ چوں کہ وہ زمانہ مذہبی تعذیب کا زمانہ تھا اس لئے ایسا ہوا کہ اسلام نے جب اپنے عقیدہ کی تبلیغ کی تو اگرچہ یہ تبلیغ سراسر پرامن تھی، مگر دوسرے مذاہب کے لوگ اس سے لڑنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ اس طرح اسلام کی تاریخ میں جنگ کے واقعات شامل ہوگئے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے دور اول کی جنگوں کا سبب اصلاً زمانی عامل تھا۔ اب چونکہ یہ زمانی عامل ختم ہوگیا، اس لئے اب اس قسم کی جنگوں کا امکان بھی اصولی طور پر باقی نہیں رہا۔

زمانی عامل کا یہ پہلو جن لوگوں کے سامنے نہیں ہے۔ وہ غلط طور پر اس کو اسلام کے اپنے اصولوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ ان کا تعلق خارجی حالات سے تھا نہ کہ خود اسلام کی داخلی خصوصیات یا اس کی اپنی تعلیمات سے۔

اسلام کی متشددانہ تصویر کا دوسرا سبب موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں کے حالات ہیں۔ اس وقت جو مسلم ممالک ہیں ان میں سے ہر ملک میں مسلمان دو بڑے طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جن کو اسلامسٹ کہا جاتا ہے، دوسرے وہ جن کو سیکولر یا لبرل طبقہ کہتے ہیں۔

موجودہ زمانہ میں عالمی سطح پر غیر مذہبی افکار کا غلبہ ہے۔ چنانچہ ان مسلم ملکوں میں جب الکشن ہوتا ہے تو سیکولر یا لبرل طبقہ حکومت کے مناصب پر قبضہ کرلیتا ہے۔ جمہوری روایات کے مطابق اسلامسٹ

طبقہ کو چاہئے کہ وہ میعاد پوری ہونے تک ان لوگوں کے اقتدار کو برداشت کرے مگر اسلامسٹ طبقہ مسلم ملکوں میں حکمرانی کو صرف اپنا حق سمجھتا ہے۔ چنانچہ جب لبرل طبقہ اقتدار کے منصب پر آجاتا ہے تو اسلامسٹ طبقہ اس کو غاصب سمجھ کر اس کے خلاف متشدد اپوزیشن کا کردار ادا کرنا شروع کردیتا ہے۔ یہ اسلامسٹ طبقہ جو کچھ کرتا ہے چوں کہ اس کو وہ اسلام کے نام پر کرتا ہے۔ اس لئے اس کی فکری یا عملی تشدد پسندی اسلام کے کھاتہ میں چلی جاتی ہے۔

یہ دراصل نام نہاد اسلامسٹ ہیں جو تشدد پسند ہیں۔ مگر ان کی غلط نمائندگی کی وجہ سے لوگ یہ سمجھ رہے ہیں کہ خود اسلام اپنی اصولی حیثیت میں ایک تشدد پسند مذہب ہے۔ حالاں کہ یہ محض غلط فہمی ہے اور اصل واقعہ کے سراسر خلاف ہے۔

اس معاملہ میں پیغمبر اسلام کی ایک حدیث ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اس حدیث میں کہا گیا ہے کہ جیسے تم ہوگے ویسے ہی تمہارے حکمراں بھی ہوں گے۔ اس حدیث کے مطابق حکمراں طبقہ دراصل سوسائٹی کا نمائندہ ہوتا ہے۔ سوسائٹی جس قسم کے حکمرانوں کو چاہتی ہے ویسے ہی حکمراں اس کے اندر سے ابھر کر اوپر آجاتے ہیں۔

اس لئے اسلام میں واضح طور پر یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تم اگر حکمرانوں میں بگاڑ دیکھو تو براہ راست حکمرانوں سے ٹکراؤ نہ کرو۔ بلکہ سوسائٹی کو بدلنے کی تعمیری کوشش میں اپنے آپ کو لگا دو۔ جس دن سوسائٹی بدلے گی، حکمراں بھی یقینی طور پر بدل جائیں گے۔ سوسائٹی ہی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اس کے اوپر کیسے حکمراں ہوں۔ اس لئے اصل مسئلہ سوسائٹی کو بدلنا ہے نہ کہ غیر ضروری طور پر حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے ان کے خلاف جنگ چھیڑنا۔

مسلم ملکوں کا اسلامسٹ طبقہ پچھلے ۵۰ سال سے فکری یا عملی طور پر اپنے حکمرانوں سے برسرپیکار ہے۔ مگر اس کام سے کوئی بھی مثبت فائدہ حاصل نہ ہوسکا۔ البتہ جو ہوا وہ یہ کہ غیر واقعی طور پر اسلام کی تصویر تشدد پسندی کی تصویر بن گئی۔

اس اسلامسٹ طبقہ کی مزید غلطی یہ ہے کہ اس نے یہ فرض کرلیا کہ ساری دنیا اسلام کی دشمن ہے۔ اس لئے ان دشمن قوموں کا زور توڑنے کے لئے وہ ان کے خلاف فکری یا عملی جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ سے تشدد کی جو فضا مسلم ملکوں میں داخلی سطح پر ہے وہی فضا انٹرنیشنل دائرہ میں پھیل گئی

ہے۔

یہ مفروضہ بھی سراسر بے معنی ہے۔ موجودہ دنیا میں کوئی بھی اسلام کا دشمن نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ یہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں ہمیشہ ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان مقابلہ جاری رہتا ہے۔ یہی انسانِ اول کے زمانہ سے ہے اور وہ قیامت تک جاری رہے گا۔ اس صورتحال کو ہمیں ایک انسانی چیلنج سمجھنا چاہئے نہ کہ اسلام دشمنی یا مسلم عداوت۔

اگر ماضی کے اعتبار سے زمانی عامل کو حذف کر دیا جائے اور حال کے اعتبار سے اسلامسٹ طبقہ کی خود ساختہ سیاست کو حذف کر دیا جائے تو اس کے بعد اسلام کی جو تصویر بنے گی وہ سراسر دین رحمت کی تصویر رہے گی، جیسا کہ فی الواقع اصولی طور پر اس کی تصویر ہے۔

دورِ جدید کا چیلنج

موجودہ زمانہ میں اسلام کو جو چیلنج پیش آیا اس کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک فکری چیلنج اور دوسرا عملی چیلنج۔

فکری چیلنج سے میری مراد وہ چیلنج ہے جو جدید عقلی اور سائنسی تہذیب کی طرف سے پیش آیا ہے۔ جدید عقلیت کے ظہور کے بعد یہ سمجھا گیا کہ اب تمام مذاہب نے اپنا منطقی جواز کھو دیا ہے۔ کہا گیا کہ مذاہب بے بنیاد مفروضات پر قائم تھے۔ سائنسی تحقیقات نے ان مفروضات کو غیر واقعی ثابت کر دیا۔ اس لئے مذاہب بھی سب کے سب غیر واقعی ثابت ہو گئے ہیں۔

یہ چیلنج نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذہبوں کے خلاف تھا۔ چنانچہ ہر مذہب کی طرف سے اعلیٰ ذہنوں نے اس کے مقابلہ کی کوشش کی۔ ۱۹ویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں ہزاروں کی تعداد میں کتابیں اور مضامین شائع کئے گئے۔ حتیٰ کہ اب یہ چیلنج زندہ اور موثر حالت میں باقی نہیں رہا۔

مثال کے طور پر عقلیت پرست طبقہ نے خدا کے وجود سے انکار کیا۔ اس کے بعد اس موضوع پر نہایت قیمتی کتابیں لکھی گئیں۔ اسی طرح عقلیت پرست طبقہ نے یہ کہا کہ مذہب انسانی فطرت پر مبنی نہیں۔ وہ سماجی روایات کے زیر اثر کسی ایک یا دوسری شکل میں بن جاتا ہے۔ پچھلے سو برس کے اندر اس پر زبردست تحقیقات ہوئیں، یہاں تک کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ثابت ہو گیا۔

وغیرہ۔

اب بیسویں صدی کے آخر میں اسلام کا اصل چیلنج فکری سطح پر نہیں ہے بلکہ عملی سطح پر ہے۔

عملی چیلنج کے سلسلہ میں بطور واقعہ یہ بات درست ہے کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کو چیلنج یا مخالفانہ صورت حال کا سامنا ہے۔ مگر میں کہوں گا کہ یہ مخالفانہ صورت حال بھی سراسر مصنوعی اور غیر حقیقی ہے۔ وہ خود مسلمانوں کی اپنی بعض نادانیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، وہ اسلام کی اصولی حیثیت کا نتیجہ نہیں۔

حقیقت کے اعتبار سے دیکھئے تو آج کی دنیا میں اسلام کے خلاف کوئی چیلنج سرے سے موجود ہی نہیں۔ آج کی دنیا پوری طرح اسلام کے موافق دنیا ہے نہ کہ اسلام کے مخالف دنیا۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ اس وقت ۹۰ ملکوں کے ۵۰ا سے زیادہ لوگ ، جو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں بلجیم کی راجدھانی میں جمع ہیں تاکہ عالمی امن کے موضوع پر غور و فکر اور دعا کریں۔ وہ نہایت سکون کے ساتھ اپنے طے شدہ پروگرام کو چلا رہے ہیں۔ یہ جمع شدہ لوگ اگر اپنا مقصد یہ بناتے کہ انھیں اس ملک کی حکومت کا تختہ الٹ کر یہاں کے ایڈمنسٹریشن کو اپنے قبضہ میں لینا ہے تو اس ملک میں ان کا تجربہ مختلف ہوتا۔ اب ان کو ہر طرف چیلنج ہی چیلنج دکھائی دیتا۔ مگر جب انھوں نے اپنا مقصد صرف یہ رکھا کہ وہ عالمی امن کے موضوع پر غور و فکر اور دعا کریں گے اور پھر واپس چلے جائیں گے تو یہاں ان کے لئے کوئی چیلنج نہیں۔ وہ پوری طرح آزاد ہیں۔ کہ اپنی مرضی کے مطابق اپنے پروگرام کی تکمیل کریں اور آخر تک کوئی ان کے راستہ میں خلل ڈالنے والا نہ ہو۔

اسلام کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ہمارے جو بھائی موجودہ دنیا کو اسلام کے لئے چیلنجوں سے بھرا ہوا دیکھتے ہیں۔ انھوں نے دراصل اسلام کی ایک خود ساختہ تعبیر کر رکھی ہے۔ ان کی اس ذاتی تعبیر کے مطابق، اسلام کا نشانہ یہ قرار پایا ہے کہ وہ سارے عالم پر حکمرانی حاصل کئے ہوئے ہو۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا سیاسی نظریہ بیک وقت سارے عالم سے متصادم ہو جائے گا۔ اس غیر واقعی تصادم کی بنا پر انھیں موجودہ دنیا اسلام کے حق میں چیلنجوں سے بھری ہوئی نظر آئے گی۔ حالانکہ اگر وہ اسلام کو اس کے صحیح معنوں میں لیں تو صورت حال یکسر بدل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ "چیلنج" ایک اضافی لفظ ہے۔ اس کا تعلق اس سے ہوتا ہے کہ آپ نے اپنا نشانہ کیا مقرر کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ جو ماحول ایک قسم کا نشانہ مقرر کرنے کی صورت میں چیلنج کا ماحول نظر آتا ہو، وہ دوسری قسم کا نشانہ مقرر کرنے کی صورت میں بالکل بے چیلنج دکھائی دینے لگے۔

چیلنج کو اگر مخالفانہ صورت حال (hostile situation) کے معنی میں لیں تو حقیقی اسلام کے لئے آج سرے سے کوئی چیلنج موجود ہی نہیں۔ پیغمبر اور آپ کے اصحاب کو قرآن میں یہ دعا سکھائی گئی تھی کہ اے ہمارے رب، ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جیسا بوجھ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا (البقرہ ۲۸۶) یہ دعا قبول ہوئی اور پچھلے ہزار سال کے دوران اللہ تعالیٰ نے عالمی تاریخ میں ایسے انقلابات پیدا کئے جس کے بعد وہ تمام چیزیں بنیادی طور پر ختم ہو گئیں جو اسلام کے لئے مسائل یا موانع بن سکتی تھیں۔ آج اہل اسلام کے لئے ہر طرف مواقع ہی مواقع ہیں۔ اب اہل اسلام کو کسی مفروضہ چیلنج سے لڑنا نہیں ہے بلکہ ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مواقع کو استعمال (avail) کریں۔ اب مسئلہ مشکلات سے لڑنے کا نہیں ہے بلکہ امکانات کو واقعہ بنانے کا ہے۔

یہاں سب سے پہلے یہ متعین کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام کیا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، اسلام اپنے آپ کو ربانی انسان بنانے کی دعوت ہے۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے لوگو، ربانی بنو، (آل عمران ۷۹) ربانی بننے کا مطلب ہے اللہ والا بننا۔ یعنی یہ کہ آدمی کو اپنے رب کی معرفت حاصل ہو۔ اس کی سوچ اور اس کے جذبات پر اللہ کا تصور غالب آجائے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھنے لگے۔ اس کا قول اور اس کا اخلاق کردار اللہ کے رنگ میں رنگ جائے (البقرہ ۱۳۸) حقیقت یہ ہے کہ اسلام سراپا ایک امن کا مذہب ہے۔ اسی لئے پیغمبر اسلام کو قرآن میں رحمت عالم کہا گیا ہے (۲۱ : ۱۰۷)

اسلام بنیادی طور پر احتساب خویش کا مذہب ہے۔ وہ احتساب غیر کا مذہب نہیں۔ اس حقیقت کو سامنے رکھئے تو یہ بات بالکل واضح معلوم ہوگی کہ اس قسم کے نظریۂ حیات کے لئے موجودہ ماحول میں کسی چیلنج کا کوئی سوال نہیں۔ اس قسم کے ایک نظریۂ حیات کو آج کے بدلے ہوئے حالات میں خوش آمدید کہا جائے گا نہ کہ اس کو چیلنج کیا جانے لگے۔ یا کوئی اس سے لڑنے کے لئے آجائے۔

یہاں ایک شخص کے ذہن میں یہ خیال آئے گا کہ پھر اسلام کے دور اول میں جنگ کے واقعات

کیوں پیش آئے، جب کہ اس دور کو اسلام کی تاریخ میں معیاری دور کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اور آپ کے اصحاب نے جنگ کو ختم کرنے کے لئے جنگ کی۔ وہ اس لئے لڑے تاکہ آئندہ اہل اسلام کو لڑنا نہ پڑے۔ تاکہ آئندہ لڑے بغیر اسلام کا عمل جاری رہے۔

دور اول کے اسلام میں جنگ کا پیش آنا زمانی عامل (age-factor) کی بنا پر تھا نہ کہ خود اسلام کے ابدی اصولوں کی بنا پر۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، اس کی ایک مثال مسیحیت کی تاریخ میں ملتی ہے۔ مسیحیت اپنے آغاز کے بعد سے لے کر ڈیڑھ ہزار سال سے بھی زیادہ مدت تک مذہبی تعذیب کا شکار رہی۔ اس کے افراد کو ہر جگہ ستایا جاتا رہا۔ موجودہ زمانہ میں مسیحی چرچ ساری دنیا میں اپنی مذہبی اور دعوتی سرگرمیاں جاری کئے ہوئے ہے، مگر اب کہیں بھی اس کے ساتھ تعذیب کا معاملہ نہیں کیا جاتا۔ اس کا واحد سبب زمانی عامل ہے۔ قدیم زمانہ مذہبی تعذیب کا زمانہ تھا، اس لئے مختلف عقیدہ رکھنے والے لوگ مسیحی افراد کو ستاتے رہتے تھے۔ موجودہ زمانہ مذہبی آزادی کا زمانہ ہے، اس لئے اب مسیحی افراد کو کہیں بھی ستایا نہیں جاتا۔

یہ ایک معلوم تاریخی حقیقت ہے کہ قدیم زمانہ میں مذہبی رواداری نہ تھی۔ ہر جگہ مذہبی تعذیب (religious persecution) کا رواج تھا۔ قدیم زمانہ کا سماج ساری دنیا میں مذہب کے معاملہ میں بے برداشت (intolerant) بنا ہوا تھا۔ چنانچہ دور قدیم کی پوری مذہبی تاریخ مذہبی تعذیب کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ جو مذہبی گروہ اقتدار پر قابض ہوتا وہ چاہنے لگتا کہ اس کے علاوہ دوسرے مذہبی عقائد اور مذہبی گروہ باقی نہ رہیں۔ اگر کوئی شخص اسٹیٹ کے مذہب کے علاوہ کوئی اور مذہبی عقیدہ رکھتا یا اسٹیٹ کے طریقہ سے مختلف کسی طریقہ پر عبادت کرتا تو صرف یہی بات اس کے لئے کافی ہو جاتی تھی کہ اُس کو اسٹیٹ کا باغی قرار دے کر اس کو سخت ترین سزا دی جائے۔ اس کی تفصیل جاننے کے لئے انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے باب مذہبی تعذیب (religious persecution) کو دیکھنا چاہئے۔

قدیم زمانہ میں آزادیٔ فکر پر پابندی کا یہ طریقہ مسلسل طور پر تاریخ میں جاری ہو گیا تھا۔ یہ نہ صرف مذہبی عمل میں رکاوٹ تھا بلکہ اس نے ہر طرح کی ترقی کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ اسلام کا جہاد (بمعنی قتال) دراصل اسی ناموافق صورت حال کو ختم کرنے کے لئے تھا۔ چنانچہ قرآن میں حکم دیا گیا کہ اگر ضرورت ہو تو ان

سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے اور دین صرف اللہ کے لئے ہو جائے (۸ : ۳۹)

اس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی تعذیب (religious persecution) ہے۔ حکم کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت جنگ کرو جب کہ تعذیب کی حالت، دنیا سے ختم ہو جائے۔ اور ہر آدمی کو یہ آزادی مل جائے کہ وہ اپنے ضمیر اور اپنے عقیدہ کے مطابق خدائے واحد پر ایمان رکھے اور اس کی پرستش کرے۔ اور اپنے سلوک کو اس کے مطابق ڈھال لے۔ اسلامی جنگ کا مقصد موانع کو ہٹانا ہے، اس کا مقصد اصلاح کا قیام نہیں۔ اصلاح کا قیام پرامن کوششوں سے ہوتا ہے نہ کہ جنگی کارروائیوں سے۔

اس سلسلہ میں ایک انتہائی متعلق واقعہ قابل ذکر ہے۔ پیغمبر اسلام کے اصحاب میں ایک صف اول کے صحابی عبد اللہ بن عمر ہیں۔ پیغمبر اسلام کے بعد ۸۵ سال کی عمر میں (۶۹۲، ۳ ۷ ھ) میں ان کی وفات ہوئی۔ عبد اللہ بن عمر کے آخری زمانہ میں ایک جنگ پیش آئی وہ اس وقت مکہ میں تھے۔ مگر وہ اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ کچھ لوگوں نے انھیں مذکورہ آیت (۸ : ۳۹) یاد دلاکر اصرار کیا کہ انھیں بھی جنگ میں شامل ہو کر لڑنا چاہئے تاکہ فتنہ کی حالت ختم ہو جائے۔

صحیح البخاری کی روایت کے مطابق، عبد اللہ بن عمر نے جواب دیا کہ قرآن میں فتنہ سے مراد مذہبی تعذیب تھی اور اس کو ہم نے لڑ کر ختم کر دیا۔ اب تم لوگ نئے نئے اسباب پیدا کر کے حکمرانوں سے جنگ کر رہے ہو۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ اور نکلنے والا نہیں کہ ختم شدہ فتنہ دوبارہ نئی شکل میں لوٹ آئے۔

فرانسیسی مورخ ہنری پرین نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اسلام کی جنگیں جو بازنطینی امپائر (اور ساسانی ایمپائر) کے ساتھ پیش آئیں ان کا مقصد مطلق شہنشاہیت (imperial absolutism) کو ختم کرنا تھا۔ چنانچہ جب یہ شہنشاہیتیں ٹوٹ گئیں تو اس کے بعد مسلم فاتحین نے وہاں کے باشندوں پر کسی بھی قسم کا کوئی جبر نہیں کیا۔

خارجی اعتبار سے اسلام کا مطلوب لوگوں کے اوپر سیاسی غلبہ حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ اسلام کا اصل مطلوب یہ ہے کہ اس کو پرامن مواقع کار حاصل رہیں۔ اس اعتبار سے اسلام کا اصل مطلوب صرف تین چیزیں ہیں :

ا مذہبی آزادی، جس کے لئے ان الفاظ میں حکم دیا گیا کہ ـــــ اور ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کے لئے ہو جائے (۸ : ۳۹)

۲ مذہبی حقائق کا دلائل عقلی کے ذریعہ ثابت شدہ بن جانا۔ اس مطلوب کا ذکر اس آیت میں ہے کہ عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق اور انفس میں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ حق ہے (۴۱ : ۵۳)

۳ مواصلات (کیمونی کیشن) کی عالمی توسیع تاکہ دین خدا کی عالمی اشاعت ممکن ہو جائے۔ اس مطلوب کو پیشین گوئی کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمایا کہ آئندہ دنیا میں کوئی کچا یا پکا گھر نہ ہوگا جہاں اسلام کا کلمہ داخل نہ ہو جائے (حدیث)

قدیم جابرانہ سلطنتوں کو توڑنے کے بعد یہ تینوں مقصد حاصل ہو گئے۔ ان کا ایک جزء فوری طور پر اسلام کے دور اول میں حاصل ہو گیا تھا۔ اور کچھ وہ تھا جو ایک انقلابی عمل (process) کے طور پر تاریخ میں جاری ہو گیا اور بالآخر اپنی تکمیل کو پہنچا۔ جدید سائنسی دنیا، ایک اعتبار سے، اس عمل کی انتہائی صورت ہے۔

قدیم زمانہ میں مختلف انبیا نصیحت اور تلقین کے ذریعہ جبر کے نظام کو بدلنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن جبر کا نظام نہیں بدلا۔ آخر کار ڈیڑھ ہزار سال پہلے اسلام نے لڑ کر جبر کے نظام کو توڑ دیا۔ اس کے نتیجہ میں پہلی بار دنیا میں آزادئ فکر کا دور آیا۔ اگر دنیا میں فکری آزادی کا یہ ماحول پیدا نہ ہوتا تو سائنس کا دور بھی کبھی نہیں آسکتا تھا۔ سائنسی تحقیق کا عمل جاری ہونے کے لئے آزادئ فکر لازمی طور پر ضروری ہے۔ اور آزادئ فکر تاریخ میں پہلی بار اسلامی انقلاب کے بعد دنیا کو ملی۔

اس عالمی تبدیلی کے بعد اسلام کے مذکورہ تینوں مقاصد پوری طرح حاصل ہو چکے ہیں۔ اب دنیا میں مذہبی آزادی بھی ہے۔ جدید سائنسی حقائق نے مذہبی عقیدہ کی علمی تصدیق بھی کر دی ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں عالمی سفر کی سہولتیں، پرنٹنگ پریس، پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا نے اس بات کو پوری طرح ممکن بنا دیا ہے کہ دین حق کی آواز ساری دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچائی جاسکے۔

موجودہ زمانہ میں کچھ مسلمانوں نے اسلام کی تشریح اس طرح کرنے کی کوشش کی ہے گویا کہ مسلمان خدا کی دنیا میں خدا کے نائب ہیں۔ خدا نے ان کو تمام انسانوں کے اوپر حاکم مقرر کیا ہے۔ اور ان کی یہ ڈیوٹی ہے کہ ساری دنیا کے اوپر اپنی حکومت قائم کر کے لوگوں کے اوپر اسلام کے قوانین نافذ کریں۔ اس قسم کا ہر نظریہ سراسر غیر قرآنی ہے۔ وہ ایک طبع زاد نظریہ ہے نہ کہ خدا کی

طرف سے اپنے پیغمبر پر اتارا ہوا نظریہ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا نظریہ خدا کی تخلیقی اسکیم کے خلاف ہے۔ قرآن کے مطابق، انسانوں کو پیدا کرکے زمین پر بسانے کا مقصد آزمائش ہے (۲ : ۷) یہ اصول جس طرح فرد کے لئے ہے اسی طرح وہ قوموں کے لئے بھی ہے۔ چنانچہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ مختلف قوموں کو ایک کے بعد ایک زمین کا خلیفہ (بااقتدار) بناتا ہے اور اس طرح ہر قوم کو آزما کر دیکھتا ہے کہ وہ کیسا عمل کرتی ہے (۶ : ۱۶۵)

اس تخلیقی اسکیم کے مطابق ضروری ہے کہ باری باری ہر قوم کو زمین کا چارج دیا جائے۔ تاکہ ہر ایک کو جانچ کر دیکھا جا سکے کہ وہ طاقت پاکر کیسے عمل کرتی ہے۔ کسی ایک گروہ کو ابدی طور پر اقتدار دینے سے یہ مقصد یکسر فوت ہو جائے گا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کے زمانہ میں غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو انھیں رنج ہوا۔ اس وقت قرآن میں کہا گیا کہ اس پر رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (۳ : ۱۴۰)

اصل یہ ہے کہ اسلامی تحریک کا نشانہ حکومت نہیں ہے بلکہ فرد ہے۔ حدیث رسول میں آیا ہے کہ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تمہارے حکمراں ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک کے عمل کا مقام عام افراد کو بدلنا ہے نہ کہ سیاسی حکمرانوں کو بدلنا۔ اسلام کے داعیوں کی محنت تمام تر افراد معاشرہ پر مرتکز رہے گی۔ البتہ اگر کسی معاشرہ کے بیشتر افراد خدا پرست بن جائیں تو اس کے بعد اس معاشرہ سے جو حکومت ابھرے گی وہ بھی ایک خدا پرست حکومت ہوگی۔

حدیث کی کتابوں میں "کتاب الفتن" کے تحت کثرت سے ایسی حدیثیں دیکھی جا سکتی ہیں جن میں سختی سے منع کیا گیا ہے کہ حکمرانوں سے نہ لڑو۔ یہ ایک بے حد اہم تعلیم ہے۔ اس تعلیم کے ذریعہ پیغمبر اسلام نے یہ متعین کر دیا کہ کسی ملک کے نظام میں جب خرابی دیکھو تو تمہاری کوششوں کا رخ کدھر ہونا چاہئے۔ تم کو ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ حکمرانوں کو خرابی کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان سے لڑنے لگو۔ بلکہ تم یہ کرو کہ عوام کی تعمیر ذہن کے کام میں لگ جاؤ۔ یہ کام بظاہر غیر سیاسی ہے مگر اس کے اندر گہرے سیاسی نتائج چھپے ہوئے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اسلام کی تفکیر مبنی بر نظام (system-based) نہیں ہے بلکہ مبنی بر فرد (individual-based) ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے عمل کو فطری انداز پر جاری

رہنے دیا جائے۔ مروجہ نظام کے تحت جن افراد کو اوپر آنے کا موقع ملے انھیں آزادانہ طور پر حکومت کا موقع دیا جائے۔ اب اگر کچھ لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت میں بگاڑ ہے تو ان کو چاہئے کہ عوام کے اندر تعمیری کام کرکے لوگوں کے ذہن میں مثبت تبدیلی پیدا کریں۔ اگر عوام کے ذہن میں تبدیلی آگئی تو اس کے بعد حکومت کا نظام اپنے آپ اس کے مطابق بن جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے خلاف جو چیلنج پیدا ہوا ہے وہ کیوں پیدا ہوا ہے، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اسلامی لیڈر ہر ملک میں یہ نعرہ لے کر کھڑے ہو گئے ہیں کہ وہ وہاں اسلامی نظام قائم کریں گے۔ مسلم لیڈروں کا یہ مقصد ہر ملک کے سیاسی نظام کے خلاف چیلنج ہے۔ اس لئے ہر ملک کا سیاسی نظام بھی اسلام کے خلاف سراپا چیلنج بن گیا ہے۔

مگر اس قسم کا مقصد بجائے خود بے بنیاد ہے۔ قرآن میں کہیں بھی یہ حکم نہیں دیا گیا ہے کہ لوگوں سے لڑکر ان کے اوپر اسلامی نظام قائم کردو۔ اس کے برعکس قرآن میں جو حکم ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ لوگوں سے لڑکر فتنہ کو ختم کرو (قاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی جہاد (بمعنی قتال) کا مقصد نظام اسلام قائم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد اسلام کے راستہ کی رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔ جب یہ رکاوٹ دور ہو جائے تو اس کے بعد جہاد (بمعنی قتال) کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس کے بعد وہ وقت آجاتا ہے کہ جہاد (بمعنی دعوت) کے عمل کو تیز تر کر دیا جائے۔

نظام اصلاح ہمیشہ افراد کی اصلاح سے ظہور میں آتا ہے۔ نظام اصلاح کبھی طاقت کے زور پر قائم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خلیفہ دوم عمر فاروق تک معاشرتی معاملات درست رہے۔ اس کے بعد ہر طرف معاملات بگڑ گئے۔ حالاں کہ جہاں تک سیاسی غلبہ کا تعلق ہے وہ بدستور اہل اسلام کے ہاتھ میں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ دوم تک معاشرہ پر ان افراد کا غلبہ تھا جو پیغمبر اسلام کے اصلاحی اور دعوتی عمل سے بنے تھے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تعداد بڑھی اور معاشرہ پر ایسے لوگوں کا غلبہ قائم ہو گیا جنھوں نے حالات کے زیر اثر اسلام تو قبول کر لیا تھا مگر ان کی اصلاح اس طرح نہیں ہوئی تھی جس طرح صحابہ کرام کی اصلاح ہوئی تھی۔

اسلام میں بلاشبہ اجتماعی اور سیاسی احکام ہیں۔ مگر ان احکام کی حیثیت وہی ہے جو زکاۃ کے

حکم کی ہے۔ زکوٰۃ کسی فرد کے اوپر اس وقت ہے جب کہ وہ صاحب نصاب ہو۔ اسی طرح اجتماعی اور سیاسی قوانین کا تعلق بھی اس مسلم معاشرہ سے ہے جو اس کی استعداد رکھتا ہو۔ جس معاشرہ کے اندر اس کی استعداد موجود نہ ہو اس کے اندر مطلوبہ استعداد پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی ، نہ کہ بزور اس کے اوپر اجتماعی قوانین کو نافذ کیا جانے لگے۔

آخری بات

موجودہ زمانہ میں اسلام کو جو چیلنج درپیش ہے وہ اصلاً باہر سے نہیں ہے بلکہ اندر سے ہے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ اللہ نے تاریخ میں تبدیلیاں کرکے اسلام کے راستہ سے تمام رکاوٹیں دور کردی تھیں۔ اب موقع تھا کہ اسلام کو ماننے والے آزادانہ طور پر اسلام پر عمل کریں اور اسی کے ساتھ ان کے لئے یہ موقع بھی تھا کہ وہ تمام دنیا کو اسلام سے متعارف کرنے کی تدبیریں اختیار کریں۔ مگر عین اس وقت اسلام کے ماننے والوں نے مفروضہ چیلنجوں سے لڑنے کے نام پر اپنی راہ میں ایسی دشواریاں پیدا کرلیں جو بہ اعتبار حقیقت آج کی دنیا میں ان کے لئے موجود نہ تھیں۔

یہی آج کا اصل چیلنج ہے اور اسی چیلنج کا مقابلہ کرنے میں اسلام کے مستقبل کا راز چھپا ہوا ہے۔

اسلام : نظریاتی سپر پاور

تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصر کی سرزمین پر ایک واقعہ گزرا۔ یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے متعلق تھا۔ قرآن میں اس واقعہ کو بیان کیا گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس واقعہ میں ابدی نصیحت ہے۔ قرآن ایک ابدی کتاب ہے۔ قرآن میں انھیں واقعات کو ریکارڈ کیا گیا ہے جن میں ابدی نصیحت کا سامان ہو۔

موسیٰ علیہ السلام نے جب شاہ مصر فرعون (Ramses II) کو توحید کی دعوت دی اور اپنی صداقت کے ثبوت میں عصا کا معجزہ پیش کیا تو فرعون نے یہ منصوبہ بنایا کہ وہ مصر کے ماہر جادوگروں کو جمع کرے اور ان کے ذریعہ سے موسیٰ کو شکست دے۔

موعد کے مطابق یوم الزینہ کو مصر کے بڑے بڑے جادوگر ایک میدان میں جمع ہوئے۔ موسیٰ کو بھی وہاں بلایا گیا۔ جادوگروں نے کرتب کرکے اپنی رسیاں اور لکڑیاں پھینکیں تو وہ موسیٰ کو سانپ کی صورت میں اپنی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئیں۔ موسیٰ کے لیے بظاہر یہ ایک پُرخطر منظر تھا۔ اس وقت جو کچھ پیش آیا اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے : فاذا حبالهم وعصيهم يخيل اليه من سحرهم انها تسعى - فاوجس فى نفسه خيفة موسى - قلنا لا تخف انك انت الاعلى - والق ما فى يمينك تلقف ماصنعوا انما صنعوا كيد ساحر ولا يفلح الساحر حيث اتى (طٰہٰ ۶۶-۶۹)

قرآن کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ بشری تقاضے کے تحت متحرک سانپوں کو دیکھ کر موسیٰ پر خوف کی کیفیت طاری ہوئی۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ موسیٰ کی نظر فریق ثانی کے ساحرانہ عمل کی طرف چلی گئی۔ اور خود ان کے اپنے پاس جو زیادہ طاقت ور عصا تھا جو اژدہا بننے کی خداداد صلاحیت رکھتا تھا، اس سے انھیں وقتی طور پر ذہول ہو گیا۔

اللہ کی طرف سے انتباہ کے بعد انھیں اپنے برتر ہتھیار کا احساس ہوا۔ اس کے بعد ان کی توجہ ساحروں کے سانپوں سے ہٹ کر اپنے عصا کی طرف ہو گئی۔ انھوں نے اس طاقت کو استعمال کیا اور اس کو سانپوں کے سامنے میدان میں ڈال دیا۔ اس کے بعد جو ہوا

وہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھا کہ فاذا ھی تلقف ما یأفکون (الاعراف ۱۱۷) اور فألقی السحرة سجدا قالوا آمنا برب ھارون وموسیٰ (طٰہٰ ۷۰)

غور کیجئے تو ماضی کی یہ تاریخ حال میں ایک نئی شکل میں لوٹ آئی ہے۔ آج دوسری قومیں اپنے فن کو استعمال کر کے مسلمانوں کے سامنے مسائل ومشاکل کا طوفان کھڑا کیے ہوئے ہیں۔ ان مخالفانہ مناظر کو دیکھ کر مسلمانوں کی وہی حالت زیادہ بڑے پیمانہ پہ ہو رہی ہے جس کی تصویر قرآن کے الفاظ میں یہ ہے کہ فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ (طٰہٰ ۶۷)

ایسی حالت میں دوبارہ خدا کی کتاب پکار پکار کر مسلمانوں سے وہی الفاظ کہہ رہی ہے جو خدا نے اسی طرح کی صورت حال میں موسیٰ سے کہا تھا۔ یعنی : لا تخف انک انت الاعلیٰ (طٰہٰ ۶۸)

یہاں یہ سوال ہے کہ موسیٰ سے تو اللہ نے عصا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ عصا تمہارا جوابی ہتھیار ہے، اس کو استعمال کرو : الق ما فی یمینک تلقف ما صنعوا (طٰہٰ ۶۹) پھر آج اہل ایمان سے خدا کی کتاب متعین صورت میں کیا کہتی ہے۔

اس کا جواب ایک حدیث میں واضح طور پر موجود ہے۔ اس حدیث کو البخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں : ما من نبی من الانبیاء الا وقد اوتی من الآیات ما آمن علی مثلہ البشر وانما کان الذی اوتیتہ وحیا اوحاہ اللہ الیّ فارجو ان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ۔

یہ حدیث واضح طور پر بتاتی ہے کہ پچھلے پیغمبروں کو جو فیصلہ کن طاقت معجزہ کی صورت میں دی گئی تھی وہ فیصلہ کن طاقت امت محمدی کو قرآن کی صورت میں ابدی طور پر دے دی گئی ہے۔ قرآن اس بات کی ضمانت ہے کہ جب بھی دنیا کی قومیں اپنے ساحرانہ ہتھیار ہمارے سامنے پھینکیں تو ہم قرآن کے ذریعہ ان کے سارے سحر کو بطل ما کانوا یعملون (الاعراف ۱۱۸) کا مصداق بنا دیں۔ حتیٰ کہ خود ارباب سحر کے دلوں کو بدل کر انھیں دائرہ اسلام میں داخل کر دیں۔ جو لوگ بظاہر اسلام کے دشمن بنے ہوئے ہیں ان کو بدل کر انھیں اسلام کا خادم اور سپاہی بنا دیں۔

قرآن کی یہ معجزاتی طاقت بار بار ماضی اور حال میں اپنا کرشمہ دکھا چکی ہے۔ وہ پہلے بھی مسلمانوں

کے حق میں عصا موسیٰ بنی ہے اور آج بھی وہ عصا موسیٰ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب مکہ سے نکل کر مدینہ پہنچے تو روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خاص کام وہاں یہ تھا کہ لوگوں کو جمع کر کے انھیں قرآن پڑھ کر سنائیں۔ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں ان کے بارہ میں بار بار یہ الفاظ آتے ہیں کہ فعرض علیہم الاسلام وتلا علیہم القرآن۔ ان کے اسی طرز تبلیغ کی بنا پر ان کو مقری کہا جانے لگا۔
اس قرأت قرآن کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدینہ کے بارہ میں تاریخ بتاتی ہے کہ : فلم تبق دار من دور الانصار الا اسلم اھلھا (سیرۃ ابن ہشام ۲/۱۱۸)
خود مصر میں قدیم زمانہ میں شرک پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کی زبان قبطی زبان تھی۔ مگر بعد کو ایسا ہوا کہ مصر کے باشندوں نے اپنا قدیم مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا۔ ان کی زبان اور تہذیب تک میں تبدیلی آگئی۔ ایسا کس طاقت کے زور پر ہوا۔ مصریات کے ایک مغربی ماہر آرتھر گیتھ (۱۸۶۶ - ۱۹۰۰) نے اس کے بارہ میں بجا طور پر یہ الفاظ لکھے ہیں کہ :

The Egyptians were conquered not by the sword, but by the Koran.

اسی طرح قرآن نے ہر دور میں انسانوں کو فتح کیا ہے۔ جس طرح موسیٰ کے زمانہ میں ان کے عصا کا یہ کرشمہ سامنے آیا کہ اس نے خود ساحری کا جال بچھانے والے افراد کو متاثر کر کے انھیں موسیٰ کا ساتھی بنا دیا۔ اسی طرح ظہور اسلام کے بعد سے اب تک مسلسل یہ واقعہ پیش آ رہا ہے کہ قرآن ارباب اسلحہ کو مسخر کر کے انھیں اسلام کی صف میں شامل کر رہا ہے۔
تیرھویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے مسلم دنیا کو اپنے مظالم سے پامال کر ڈالا۔ مگر نصف صدی کے اندر قرآن نے ان کو فتح کر لیا۔ پروفیسر ہٹی نے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کر لی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے :

The religion of the Muslims had conquered where their arms had failed.

اسی طرح قرآن ہر دور میں دلوں کو فتح کرتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہر روز

ساری دنیا میں لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں۔ حتی کہ عالمی اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اسلام سب سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پھیلنے والا مذہب ہے۔

اسلام کی یہ تمام فکری فتوحات قرآن اور قرآنی تعلیمات کے ذریعہ ہو رہی ہیں۔ آپ جس نومسلم کے بارہ میں بھی تحقیق کریں وہ یہی کہے گا کہ میں قرآن کو پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔ مجھے قرآن کی باتوں نے مسخر کر لیا۔

۱۹۹۰ کے آخر میں جب امریکی فوجیں خلیج میں بڑی تعداد میں جمع ہو گئیں تو ان میں سے بہت سے فوجیوں نے صرف قرآن کی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ مثال کے طور پر قاہرہ کے جریدہ "آخر ساعۃ" کے شمارہ ۱۲ رجب ۱۴۱۱ھ نے یہ واقعہ چھاپا ہے کہ حفر الباطن (سعودی عرب) میں جو امریکی فوجی مقیم تھے، ان کے سامنے مصر کے ایک پروفیسر دکتور زغلول النجار کے چند لکچر ہوئے جس میں انھوں نے امریکی فوجیوں کے سامنے قرآن کی تعلیمات سادہ انداز میں بیان کیں۔ اس کو سن کر حفر الباطن کے تقریباً دو ہزار امریکی مسلمان ہو گئے۔

مکہ کے ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی کے شمارہ ۲۹ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ میں یہ رپورٹ چھپی تھی کہ عیسائی تنظیموں نے ساڑھے چھ ہزار تربیت یافتہ مسیحی مبلغ لیبیریا (افریقہ) میں بھیجے تاکہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنائیں۔ مگر وہاں پہنچ کر جب ان مسیحیوں کا ربط مسلمانوں سے ہوا اور وہ قرآن کی تعلیمات سے واقف ہوئے تو ان کی بیشتر تعداد نے اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح کے بہت سے واقعات ماضی اور حال کی تاریخ میں موجود ہیں جو اسلام کی تسخیری قوت کو بتاتے ہیں۔ یہ واقعات مسلمانوں کو پیغام دے رہے ہیں کہ اپنے حریف کی ظاہری طاقت سے نہ گھبراؤ بلکہ اپنے خدائی ہتھیار کو استعمال کرو۔ اس کے بعد تم اس کا یہ کرشمہ دیکھو گے کہ: فاذا الذی بینک و بینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم (حم السجدہ ۳۴)

قرآن کی اس تسخیری طاقت کا سبب کیا ہے۔ وہ کیوں لوگوں کو جیت رہا ہے۔ اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ روجر گارودی (پیدائش ۱۹۱۳) ایک ملحد اور فرانس کی کمیونسٹ پارٹی کے رہنما تھے۔ انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا اور اس سے متاثر ہو کر ۱۹۸۲ میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ انھوں نے اسلام پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی اسلامی خدمات کی بنا پر ان کو جائزۃ الملک الفیصل

دیا گیا ہے۔ انعام لینے کے لیے جب وہ ریاض گئے تو وہاں انھوں نے ایک مفصل تقریر کی۔ یہ تقریر فرانسیسی زبان میں تھی۔ اس کا عربی ترجمہ ریاض کے روزنامہ الریاض میں چھپا تھا جس کا عنوان تھا : کیف اسلمت۔

اس تقریر میں گارودی نے بتایا کہ میں نے اسلام اس لیے قبول کیا تاکہ میں اپنی زندگی کو معنویت دے سکوں (حتی اعطی لحیاتی معنی) ان کے پاس بظاہر سب کچھ تھا مگر اسلام کے بغیر انھیں اپنی زندگی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ اسلام کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ اب میری زندگی با معنی ہوگئی ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں دین توحید کی طلب پیدائشی طور پر موجود ہے۔ اس طلب سے کوئی بھی شخص خالی نہیں جیسا کہ قرآن میں کہا گیا ہے : فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق اللہ ذلك الدین القیم (الروم ۳۰) آدمی اپنی اس طلب کے تحت مختلف مذہبی کتابوں کو پڑھتا ہے۔ مگر قرآن کے سوا تمام مذہبوں کی کتابیں محرف ہو چکی ہیں۔ اس لیے ان کتابوں میں اور فطرت انسانی میں عدم مطابقت پیدا ہوگئی ہے۔ انسان ان محرف کتابوں میں اپنی طلب کا جواب نہیں پاتا۔ اور اس بنا پر انھیں رد کر دیتا ہے۔

مگر قرآن پوری طرح تحریفات سے پاک ہے۔ وہ مکمل طور پر دین فطرت ہے۔ چنانچہ جب آدمی قرآن کو پڑھتا ہے تو بے آمیز ہونے کی بنا پر قرآن اس کے عین دل کی آواز بن جاتا ہے۔ آدمی قرآن کو اپنا مطلوب سمجھ کر اسے اختیار کر لیتا ہے۔

ایک جاپانی مستشرق کو جاپانی انسائیکلوپیڈیا کے لیے اسلام پر مقالہ لکھنے کا کام دیا گیا۔ اس نے اپنے مقالہ کے لیے قرآن کا اور پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ اس طرح کے واقعات بار بار اسی لیے پیش آتے ہیں کہ اسلام دین فطرت ہونے کی بنا پر اور تحریف سے پاک ہونے کی بنا پر اپنے اندر ہر انسان کے لیے مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ اسلام کے بغیر اس کو اپنی زندگی خالی از معنی نظر آتی ہے اور اسلام کے بعد وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کی زندگی نے اپنی مطلوب معنویت کو پا لیا ہے۔

اسلام کا دین فطرت ہونا اس کے اندر غیر معمولی تسخیری صفت پیدا کر دیتا ہے۔ مزید یہ کہ

وہ واحد غیر محرف مذہب ہے۔ اس کی اس صفت نے اس کو بلامقابلہ کامیابی (unopposed victory) حاصل کرنے کی پوزیشن عطا کر دی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ آج کی دنیا میں فوجی سپر پاور ہے۔ اور جاپان آج کی دنیا میں اقتصادی سپر پاور ہے۔ مگر اسلام ابدی طور پر نظریاتی سپر پاور ہے۔ وہ دوسری تمام طاقتوں پر غالب آجانے والا ہے۔ جو دین خود صاحب طاقت کو مسخر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اس کے تسخیری امکانات کی کوئی حد نہیں۔

مگر موجودہ زمانہ کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلمان اس حقیقت سے بے خبر ہو گئے ہیں کہ خدا کی محفوظ کتاب اور خدا کا بے آمیز دین جو ان کے پاس ہے وہ اپنی ذات میں ایک طاقت ہے۔ اس کے ذریعہ وہ افراد کو اور قوموں کو مسخر کر سکتے ہیں۔ عصائے موسیٰ اپنے ہاتھ میں رکھتے ہوئے وہ فرعون اور اس کے لشکر سے خوفزدہ ہو رہے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۹۱ میں مالٹا میں ایک انٹرنیشنل مذہبی کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف عالمی مذاہب کے لوگ شریک ہوئے۔ منتظمین کی دعوت کے تحت میں بھی اس میں شریک تھا۔ وہاں میری ملاقات ایک عرب عالم سے ہوئی۔ وہ افریقہ کی ایک یونی ورسٹی میں استاد ہیں۔

وہ مالٹا کے حالات سے کافی واقف تھے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ مالٹا میں صد فی صد آبادی عیسائیوں کی ہے۔ یہاں ایک بھی مسلمان نہیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں ایک مثل مشہور ہے کہ ـــــــ فلانٌ کمن یؤذّنُ فی مالطا (فلاں شخص ایسا ہے جیسے کوئی مالٹا میں اذان دے) یعنی اذان نمازیوں کو پکارنے کے لیے دی جاتی ہے۔ جہاں نمازی نہ ہوں وہاں اذان پکارنا بے فائدہ ہے۔ اسی طرح فلاں شخص ایسا عمل کر رہا ہے جس کا اس کے ماحول میں کوئی رسپانس ملنے والا نہیں۔

یہ ایک علامتی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں کس طرح دعوت کا شعور یکسر ختم ہو گیا ہے۔ وہ مسلمانوں کو پکارنا جانتے ہیں مگر غیر مسلمانوں کو پکارنے کے کام سے وہ واقف نہیں۔ حالانکہ خود اذان میں بھی دعوت کا شعور پوری طرح موجود ہے۔ اس میں موذن کو اگر حیّ علی الصلاۃ کے الفاظ تلقین کیے گئے ہیں تو اسی کے ساتھ اس میں حیّ علی الفلاح کے الفاظ بھی پکارنے کے لیے موجود ہیں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان غیر مسلموں کو جہاد کا موضوع بنائے ہوئے ہیں اور مسلسل شکست کھارہے ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک اجتہادی غلطی تھی جس میں موجودہ زمانہ کے تمام مسلم رہنما مبتلا رہے۔ صحیح یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام ہمارے لیے مدعو کے حکم میں ہیں۔ ہمیں ان کو دعوت کا موضوع بنانا ہے۔ مسلمان جس دن یہ فیصلہ کریں گے کہ اقوام عالم ان کے لیے مدعو ہیں اور ان کے ساتھ انھیں داعیانہ انداز میں معاملہ کرنا ہے، اسی دن سے ان کی تاریخ بدلنا شروع ہو جائے گی۔

تاہم قرآن کی دعوتی طاقت کو استعمال کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ شرط پوری کی جائے جو اس طاقت کے ظہور کے لیے ضروری ہے۔ یہ شرط، ایک لفظ میں صبر ہے۔

قرآن کی دعوتی طاقت کے استعمال کے لیے مسلمانوں کو داعی بننا ہوگا اور دوسری قوموں کو مدعو کا درجہ دینا ہوگا۔ داعی اور مدعو کا رشتہ بے حد نازک رشتہ ہے۔ اس میں داعی کو یک طرفہ صبر کے ذریعہ اپنے اور مدعو کے درمیان تمام نزاعات کو ختم کرنا ہوتا ہے تاکہ وہ موافق فضا پیدا ہو جس میں دعوت کا عمل جاری ہو سکے۔

دوسری قومیں اگر زیادتی کریں تب بھی مسلمانوں کو ان سے نہیں الجھنا ہے۔ وہ اگر اشتعال انگیزی کریں تب بھی مسلمانوں کو مشتعل نہیں ہونا ہے۔ مسلمانوں کو ہر حال میں ان کا خیر خواہ رہ کر انھیں دعوتِ حق کا مخاطب بنانا ہے۔ دعوت کا عمل یک طرفہ برداشت اور یک طرفہ خیر خواہی چاہتا ہے۔ اس کے بغیر کسی قوم کے اوپر دعوت کا عمل جاری نہیں کیا جاسکتا۔

باب دوم

اثر العقیدہ فی تطبیق الشریعہ

قانون کی تاریخ کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ شرعی قانون جب ایک معاشرہ میں نافذ کیا گیا تو وہ پوری طرح نافذ ہوگیا۔ دور اول کے اسلامی معاشرہ سے لے کر موجودہ زمانہ کی سعودی مملکت تک کا تجربہ اس کی عملی تصدیق ہے۔ اس کے برعکس دوسرے قوانین کا یہ حال ہے کہ جب وہ جاری کیے جاتے ہیں تو انسان کوئی نہ کوئی فرار (escape) تلاش کر کے ان کو جزئی یا کلی طور پر کالعدم کر دیتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس قانونی فراریت نے ایک منظم کاروبار کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں بہت بڑے پیمانہ پر وہ ادارہ قائم ہے جس کو لیگل پروفیشن کہا جاتا ہے۔ ایک امریکی مبصر نے بجا طور پر اس کو لوپ ہول انڈسٹری (loophole industry) کا نام دیا ہے۔ اس ادارہ کے تحت اعلیٰ ترین ذہن اس کام میں لگے ہوئے ہیں کہ جو قانون ان کے سامنے آئے اس کے اندر وہ کوئی ایسا خلا تلاش کر لیں جس کے ذریعہ اس کے عملی انطباق کو ناممکن بنا دیا جائے۔

یہ فرق کیوں ہے کہ شرعی قانون کے لیے پیروی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور وضعی قانون کا معاملہ ہو تو اس سے بچنے کی راہ تلاش کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرعی قانون کے ساتھ ایک مقدس عقیدہ موجود ہوتا ہے۔ مگر وضعی قانون (man-made law) کے ساتھ اس قسم کا کوئی عقیدہ موجود نہیں۔ شرعی قانون کی یہ حیثیت کہ وہ خدائی قانون ہے، اس کو ہر ایک کے لیے قابل قبول بنا دیتا ہے۔ جب کہ وضعی قانون کے متعلق یہ ذہن ہوتا ہے کہ وہ ہمارے ہی جیسے انسانوں کا بنایا ہوا ہے، اس کو قبول نہ کرنے میں کسی ایسے خطرہ کا اندیشہ نہیں جس سے بچنا ممکن نہ ہو۔

دوسرے قوانین صرف قوانین ہیں۔ مگر شریعت، قانون کے ساتھ عقیدہ بھی ہے۔ یہ اس کی ایک امتیازی صفت ہے۔ اس کی وجہ سے اسلامی قانون کے حق میں استثنائی طور پر ایک تائیدی عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ یہی تائیدی عنصر ہے جس نے اس بات کو ممکن بنایا ہے کہ کوئی اسلامی قانون جب دیا جائے تو عملاً وہ پوری طرح نافذ بھی ہو جائے۔ جب کہ وضعی قوانین کا تجربہ بتاتا ہے کہ پارلیمنٹ قانون تو بنا دیتی ہے مگر بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ ایسا کوئی قانون، ان لوگوں کے اوپر پوری طرح نافذ بھی ہو سکے جن کے لیے وہ بنایا گیا ہے۔

سیکولر علماء کا اعتراف

اسلام (یا مذہب حق) کی اس امتیازی صفت کا اعتراف وہ سیکولر علماء بھی کرتے ہیں جنھوں نے قانون اور سماج کے معاملات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ ان کا اعتراف اگرچہ ان کے اپنے ذہن کے مطابق ہوتا ہے، تاہم اصولی طور پر وہ شریعت یا مذہبی قانون کی اس خصوصیت کو تسلیم کرتے ہیں کہ قانون کے نفاذ کو ممکن بنانے کے لیے اس کے یہاں ایک ایسا مزید عنصر موجود ہوتا ہے جو عام سیکولر قوانین میں پایا نہیں جاتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ ان میں ایسا اضافی عنصر پایا جائے۔

مثال کے طور پر برٹرینڈرسل (۱۸۷۲-۱۹۷۰) نے انگریز فلسفی جان لاک (John Locke) کے نقطۂ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک شخص جو ابھی نیک جذبات رکھتا ہے۔ اس کے اندر قزاق بننے کی خواہش ابھری، تو وہ اپنے سے کہے گا کہ میں انسانی مجسٹریٹ سے بچ سکتا ہوں مگر میں خدائی مجسٹریٹ کے ہاتھ سے سزا پانے سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔ اس احساس کے مطابق وہ اپنے بُرے منصوبوں کو چھوڑ دے گا اور اس طرح نیک اور صالح بن کر رہے گا جیسے کہ اس کو بالکل یقین ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو یقینی طور پر وہ پولیس کے ذریعہ پکڑ لیا جائے گا:

> The hitherto virtuous man who is tempted to become a highwayman will say to himself: 'I might escape the human magistrate, but I could not escape punishment at the hands of the Divine Magistrate.' He will accordingly renounce his nefarious schemes, and live as virtuously as if he were sure of being caught by the police. (p. 594)
>
> Bertrand Russell, *A History of Western Philosophy,* Unwin Paperback, London, 1984.

ایک انسان روبوٹ کی مانند نہیں ہوتا۔ روبوٹ مجبور ہے کہ وہ وہی کرے جو اس کا مشینی نظام اس کو کرنے کے لیے کہتا ہو۔ مگر انسان ایک زندہ اور خود فکر مخلوق ہے۔ وہ آزاد ارادہ کا مالک ہے۔ اس لیے انسان اسی وقت کامل اطاعت پر راضی ہوتا ہے جب کہ اس کا ارادہ بھی خارجی حکم کے مطابق ہو۔ اگر اس کا اپنا ارادہ مطابقت نہ کرے تو وہ ہر خارجی حکم سے فرار کا راستہ تلاش کر لے گا اور محض خارجی حکم کے ذریعہ اس کو پابند بنانا ممکن نہ ہو گا۔

یہاں دو تقابلی مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔ ایک، قدیم دور سے متعلق۔ اور دوسری، جدید دور سے متعلق۔ ان مثالوں سے اس معاملہ کی تجرباتی وضاحت ہو جاتی ہے۔

تقابلی مثال ـ ۱

قدیم عرب کے بتوں میں سے ایک بت ذوالخلصہ تھا۔ وہ مکہ اور یمن کے درمیان تبالہ کے مقام پر نصب تھا۔ کہا جاتا ہے کہ امرؤ القیس کے باپ کو بنو اسد کے کچھ لوگوں نے قتل کر دیا۔ امرؤالقیس نے اپنے باپ کا بدلہ لینے کے لیے بنو اسد پر حملہ کرنا چاہا۔ وہ ذوالخلصہ کے یہاں آیا اور پانسہ کے مقرر طریقہ پر تیروں کے ذریعہ بُت کا فیصلہ معلوم کرنا چاہا۔ بت کا جواب "نہیں" کی صورت میں آیا۔ اس نے دوسری اور تیسری بار پانسہ نکالا۔ مگر ہر بار نہیں کا جواب آیا۔ اس کے بعد امرؤ القیس نے ایک لکڑی کھینچ کر بت کو مارا اور یہ شعر کہا :

لو كنتَ ياذا الخَلَصِ الموتُورا مِثْلي وكانَ شيخُكَ المقبورا
لَم تَنْهَ عَن قتلِ العُداةِ زُورا

(سیرۃ ابن ہشام ۱/۹۱ ، البدایہ والنہایہ ۲/۲۱۹)

ترجمہ : اے ذوالخلصہ ، اگر تو میری طرح ہوتا کہ تیرا بزرگ خاندان دفن کر دیا گیا ہوتا اور تو اس کے خون کا بدلہ نہ لے سکا ہوتا تو دشمنوں کو قتل کرنے سے غلط طور پر تو منع نہ کرتا ۔

ذوالخلصہ انسانوں کا تراشا ہوا بت تھا۔ تیروں کے ذریعہ اس کا فیصلہ معلوم کرنے کا طریقہ بھی خود انسانوں ہی نے وضع کیا تھا۔ اس بنا پر اس فیصلہ میں تقدس اور حتمیت کا تصور نہیں آ سکتا تھا۔ چنانچہ اس کا مفروضہ فیصلہ جب امرؤ القیس کو اپنی مرضی کے خلاف معلوم ہوا تو وہ بگڑ گیا۔ اس نے فیصلہ کے خلاف بنو اسد پر حملہ کر دیا اور اس طرح اپنے انتقام کی آگ بجھائی ۔

اب اس کا تقابل، ایک اسلامی واقعہ سے کیجیے۔ یہ واقعہ اسلام کے دور اول کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے :

عَن ابي مسعودِ البدريّ رضي اللّٰه عنه ، قال كنتُ اضربُ غلامًا لي بالسَّوطِ فسمعتُ صوتًا مِن خلفي - اعلم ابامسعود - فلَم أفهَم الصَّوتَ مِنَ الغضبِ - فلمّا دنا منّي اذا هُو رسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ، فاِذا هُو يقولُ : اِعلَم ابامسعود أنّ اللّٰهَ أقدرُ عليكَ مِنكَ على هذا الغلامِ - فقلتُ لا اضربُ مملوكًا بعده ابدًا (وفي رواية) فسقطَ السوطُ مِن يدِي مِن هَيبَتِه (وفي رواية) فقلتُ يارسولَ اللّٰه هُو حُرٌّ

لوجہِ اللّٰہِ - فقال امّا انّہٗ لولم تفعل للفحتک النار او لمستک النار
(رواہ مسلم بھذہ الروایات)

ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرا ایک غلام تھا، اس کو میں کوڑے سے مار رہا تھا۔ پھر میں نے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنی کہ اے ابومسعود جان لو۔ مگر غصہ کی وجہ سے میں اس آواز کو سمجھ نہ سکا۔ پھر جب پکارنے والا میرے قریب آگیا تو معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ فرما رہے تھے کہ اے ابومسعود، جان لو کہ اللہ تمہارے اوپر اس سے زیادہ قادر ہے جتنا تم اس غلام کے اوپر قادر ہو۔ میں نے کہا کہ اب میں کبھی کسی غلام کو نہیں ماروں گا۔ ہیبت کی وجہ سے کوڑا میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ، یہ غلام اللہ کی خاطر آزاد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تم ایسا نہ کرتے تو یقیناً آگ تم کو پکڑ لیتی۔

اس واقعہ میں برعکس طور پر ہم دیکھتے ہیں کہ حکم آتے ہی آدمی جھک جاتا ہے اور آخری حد تک اس کو قبول کر لیتا ہے، خواہ وہ اس کے نفس کے کتنا ہی خلاف ہو۔ اس فرق کا راز عقیدہ ہے۔ اس دوسرے حکم کے ساتھ عقیدہ کا تائیدی عنصر موجود تھا، یہی وجہ ہے کہ آدمی اس کے خلاف سوچ نہ سکا۔ اس نے فوراً اس کو قبول کر لیا۔ کیوں کہ اس کو اندیشہ تھا کہ اگر میں نے اس کو نظر انداز کیا تو ایک ایسی آگ مجھ کو پکڑے گی جس سے بچنا میرے لیے ممکن نہیں۔

تقابلی مثال ــ ۲

اب اس سلسلہ کی ایک اور تقابلی مثال لیجیے۔

شراب نوشی متفقہ طور پر ایک مضر عادت ہے۔ انسان کے جسم اور دماغ دونوں پر اس کے نہایت برے اثرات پڑتے ہیں جس کے نتیجہ میں براہ راست طور پر فرد اور بالواسطہ طور پر پوری سوسائٹی کو اس کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے (1/440)

چنانچہ انیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں شراب نوشی کے خلاف بہت سی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں جن کو عام طور پر ترک شراب کی تحریکیں (temperance movements) کہا جاتا ہے (IX/877)
ان تحریکوں کے زیر اثر بیشتر ترقی یافتہ ملکوں میں جزئی شراب بندی کے قوانین بنائے گئے۔ مگر کہیں بھی ان قوانین کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے علاوہ دو مغربی ملک ایسے ہیں جہاں قومی سطح

پر مکمل شراب بندی کا قانون نافذ کیا گیا۔ مگر ہر قسم کی اعلیٰ کوششوں کے باوجود وہ بھی اپنے مقصد میں ناکام رہے۔ ان میں سے ایک فنلینڈ ہے۔ یہاں قومی شراب بندی ایکٹ ۱۹۱۹ میں بنایا گیا۔ اس کو جاری کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی۔ مگر مکمل ناکامی ہوئی۔ آخر کار ۱۹۳۱ میں اس کو منسوخ کر دینا پڑا (16/335)

اسی طرح امریکہ میں ۱۹۱۹ میں نیشنل پروہبشن ایکٹ (National Prohibition Act) منظور کیا گیا۔ اس کے مطابق، ناگزیر طبی ضرورتوں (medicinal purposes) کے سوا ہر دوسرے مقصد کے لیے شراب کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مگر اس قانون کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ امریکہ میں پہلے سے بھی زیادہ بڑے پیمانہ پر خفیہ شراب نوشی ہونے لگی اور شراب کا خفیہ کاروبار سارے ملک میں طوفان کی طرح پھیل گیا۔ اس کے نتیجہ میں جرائم اور حادثات بہت بڑھ گئے۔ جب شراب کو روکنے کے لیے حکومت کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں تو ۱۹۳۲ میں سابقہ قانون کو منسوخ کر کے دوبارہ شراب کی عام اجازت دے دی گئی (VIII/233)

فنلینڈ اور امریکہ میں شراب بندی کا جو قانون بنایا گیا وہ ایک وضعی قانون تھا۔ اس قانون کو بنانے والے انسان تھے، اس لیے ناممکن تھا کہ دوسرے انسان اس کو مقدس سمجھیں اور اس کی تعمیل کو اپنے لیے ضروری قرار دیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ وہاں قانون تھا مگر وہاں عقیدہ نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دورِ جدید کے تمام طاقت ور ذرائع کو استعمال کرنے کے باوجود وہ سراسر ناکام ہوگیا۔

اب اس کے بالمقابل، اسی نوعیت کی ایک اسلامی مثال لیجئے۔ اسلام جب عرب میں آیا، اس وقت عرب کے لوگ کثرت سے شراب کے عادی تھے۔ ان کی زبان میں شراب کے تقریباً ڈھائی سو نام تھے۔ اپنے اشعار میں اور اپنی مجلسوں میں وہ شراب کے زبردست تذکرے کرتے تھے۔

ان کے درمیان اسلام کی تبلیغ کی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے اسلام کے عقیدہ کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد قرآن میں حکم آیا کہ اے ایمان والو، بے شک شراب اور جُوا اور تھان اور پانسے سب گندے ہیں، اور شیطان کے کام ہیں۔ پس تم ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جُوے کے ذریعہ تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تم کو اللہ کی یاد

اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم ان سے باز آؤ گے (المائدہ ۹۰ – ۹۱)

یہ حکم آتے ہی اہل ایمان کہہ اٹھے : انتھینا انتھینا (ہم باز آئے، ہم باز آئے) لوگوں نے اس حکم کے بعد یک لخت شراب چھوڑ دی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ :

وامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم منادیہ ان ینادی فی سکک المدینۃ۔ الا ان الخمر قد حرمت۔ فکسرت الدنان واریقت الخمر حتی جرت فی سکک المدینۃ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۶/۲۹۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے منادی کو حکم دیا کہ وہ مدینہ کے محلوں میں پکار کر کہہ دے کہ اے لوگو، شراب حرام کر دی گئی۔ اس کے بعد شراب کے مٹکے توڑ دیے گئے اور شراب بہا دی گئی۔ یہاں تک کہ وہ مدینہ کے راستوں میں بہہ پڑی۔

اسلامی تاریخ کے اس واقعہ کا اعتراف امریکی پروفیسر مارک کیلر (Mark Keller) نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ شراب پر مذہبی پابندی کے معاملہ میں ایک بالکل مختلف طریقہ اسلام میں ساتویں صدی میں اختیار کیا گیا۔ قرآن نے سادہ طور پر بس شراب کی مذمت کی اور اس کا نتیجہ عرب اور دوسرے مقامات پر محمدؐ کے پیروؤں میں موثر اجتناب کی صورت میں ظاہر ہوا :

> Quite a different kind of religious control was adopted later (in the 7th century) in Islam: the Qur'an simply condemned wine, and the result was an effective prohibition wherever the devout followers of Muhammad in Arabia and other lands prevailed. (1/441-42)

عقیدہ : ایک تائیدی عنصر

مذکورہ تقابلی واقعات میں اسلام کا تجربہ مختلف کیوں ہے۔ اس کی واحد وجہ وہی چیز ہے جس کو عقیدہ کہا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں کے قانون کے برعکس، اسلام کے حکم کے ساتھ عقیدہ کا تائیدی عنصر موجود تھا۔ اس عنصر نے اسلام کے حکم کو خدائی حکم کی حیثیت دے دی۔ اور جب کسی حکم کے بارہ میں آدمی کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ خدائے برتر کا حکم ہے تو اس کے بعد اس کے اندر سے فرار کی سوچ ختم ہو جاتی ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ مجھے ہر حال میں اس حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ اس کے سوا میرے لیے کوئی اور چارہ نہیں۔

اوپر ہم نے پروفیسر مارک کیلر کا قول نقل کیا ہے۔ وہ مطالعہ خمریات

(studies on alcohol) کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں مختلف معاشروں کا مطالعہ کرنے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ شراب کے نقصانات کی بنا پر بہت سی قوموں میں اس کی ممانعت کے قوانین بنائے گئے۔ مگر کہیں بھی کوئی حقیقی عملی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ اس معاملہ میں اسلام کی تاریخ ایک استثناء کی حیثیت رکھتی ہے جہاں شراب بندی کا حکم آیا تو فوراً ہی وہ عملاً نافذ بھی ہو گیا۔

اسلام کی اس امتیازی خصوصیت کا اعتراف اکثر محققین نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر برطانی مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی کتاب تہذیب کا امتحان (Civilization on Trial) میں لکھا ہے کہ مغربی دنیا نسل پرستی (racism) کی مہلک سماجی برائیوں میں مبتلا ہے۔ مگر اب تک کی تمام قانونی کوششیں اس کو ختم کرنے میں ناکام ثابت ہوئی ہیں جب کہ اسلام نے اس مسئلہ کو نہایت کامیابی کے ساتھ حل کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمانوں میں نسلی امتیاز کا ختم ہو جانا اسلام کا ایک عظیم اخلاقی کارنامہ ہے۔ اور آج کی دنیا میں اس اسلامی خوبی کی تبلیغ ایک شدید ضرورت بن گئی ہے :

> The extinction of race consciousness as between Muslims is one of the outstanding moral achievements of Islam, and in the contemporary world there is, as it happens, crying need for the propagation of this Islamic virtue. (p.205).

اسی طرح انڈیا کے مشہور ہندو مفکر سوامی ویویکانند نے اسلام کی اس امتیازی صفت کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب (Letters) میں لکھا ہے کہ انسانی اخوت اور انسانی مساوات کو قائم کرنے کی کوشش اگرچہ ہر جگہ کی گئی ہے۔ مگر عملی طور پر اگر کوئی مذہب برابری کا نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے :

> My experience is that if ever any religion approached to this equality in an appreciable manner, it is Islam and Islam alone. (p. 379)

یہی معاملہ تمام قوانین کا ہے۔ غیر اسلامی معاشروں کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب ان کا قانون ساز ادارہ کوئی قانون بناتا ہے تو بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ قانون معاشرہ کے اندر پوری طرح نافذ ہو جائے۔ اس کے برعکس اسلامی معاشرہ کا حال یہ ہے کہ جب اس کے لیے ایک قانون مقرر کیا جاتا ہے تو

عین اسی کے ساتھ وہ لوگوں کی زندگیوں میں بالفعل قائم بھی ہو جاتا ہے۔

اسلام کی اِس استثنائی خصوصیت کا سبب وہی چیز ہے جس کو عقیدہ کہا جاتا ہے۔ اسلام کا اعتقادی نظام اس کے قانونی نظام کے حق میں ایک خصوصی تائیدی عنصر (supporting element) کی حیثیت رکھتا ہے۔

انسانی معاشرہ میں کسی قانونی حکم کو عملاً جاری کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ کے اندر اس کے مطابق ذہنی تشکیل (frame of mind) بھی موجود ہو۔ عقیدہ یہی اہم کام کرتا ہے۔ عقیدہ قانون کے حق میں ضروری ذہنی تشکیل فراہم کرتا ہے۔ عقیدہ آدمی کے اندر مطلوب سوچ پیدا کرتا ہے۔ وہ قانون کی پیروی کو خود آدمی کی اپنی ضرورت بنا دیتا ہے نہ کہ محض کسی خارجی ادارہ کی ضرورت۔

اس قسم کا برحق اور کامل عقیدہ صرف اسلام میں ہے جو کہ ایک محفوظ دین ہے۔ اس لیے اسلام ہی استثنائی طور پر یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ جب وہ اپنے صاحبِ عقیدہ گروہ کے اندر کوئی قانون نافذ کرے تو وہ کسی رکاوٹ کے بغیر عملاً نافذ بھی ہو جائے۔

کسی انسانی گروہ میں عقیدہ کا پیدا ہونا اس کے اندر ایک فکری تبدیلی کا پیدا ہونا ہے۔ اس طرح عقیدہ اسلامی شریعت کے لیے ایک موافق شعوری انقلاب کے ہم معنی ہے۔ اسلام کے دورِ اول میں جو مسلم معاشرہ بنا وہ اسی طرح شعوری انقلاب کا حامل ایک معاشرہ تھا۔ اس اعتبار سے وہ ایک مثالی اعتقادی معاشرہ تھا۔ اس لیے اس معاشرہ کے درمیان شرعی احکام کی تطبیق بھی مثالی انداز میں ہوئی۔ اور اسی لیے اس کی حیثیت دائمی قُدوہ کی قرار پائی۔

بعد کے دور کے مسلم معاشرہ میں جس درجہ کی اعتقادی حالت پائی جائے گی، اس کے درمیان اسی درجہ کی شرعی تطبیق بھی وقوع میں آئے گی۔

قانون طاقت کے زور پر نافذ کیا جاتا ہے۔ مگر عقیدہ کو طاقت کے ذریعہ پیدا نہیں کیا جاسکتا۔ عقیدہ کو صرف دل و دماغ کی راہ سے انسان کے اندر داخل کیا جاسکتا ہے۔ عقیدہ ماننے کی چیز ہے، وہ منوانے یا نافذ کرنے کی چیز نہیں۔ انسانوں کے کسی مجموعہ کے اندر عقیدہ پیدا کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ ان کے اندر فکری انقلاب لایا جائے۔ دعوتی جدوجہد کے ذریعہ ایک ایک فرد کے ذہن میں وہ سوچ پیدا کی جائے جو عقیدہ کے مطابق آدمی کے اندر ہونی چاہیے۔

حصہ دوم

انسان کا عمل اس کی سوچ اور اس کی ذہنی افتاد کے تابع ہوتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے: قل کل یعمل علی شاکلتہ (الاسراء ۸۴) یعنی ہر آدمی اپنے شاکلہ (ذہنی سانچہ) کے مطابق عمل کرتا ہے۔ فرد کا معاملہ ہو یا سماج کا، ہر ایک کے لیے وہی عملی صورت قابلِ قبول ہوتی ہے جو اس کے ذہنی شاکلہ کے مطابق ہو۔ اس لیے عمل انسانی کو بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے شاکلۂ انسانی کو بدلا جائے۔

یہ ایک فطری حقیقت ہے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس نے تطبیق شریعت کے لیے عقیدہ کو بنیادی اہمیت دے دی ہے۔ شریعت کی مثال اگر درخت سے دی جائے تو عقیدہ کی حیثیت بیج کی ہوگی۔ عقیدہ، شریعت کے حق میں نظریاتی جواز فراہم کرتا ہے۔ عقیدہ جب تک فکر اور نظریاتی ماحول نہ بنائے، شریعت کے قانونی احکام کو کسی معاشرہ میں عملاً قائم نہیں کیا جا سکتا۔

عقیدہ سے مراد معروف معنوں میں کوئی جامد عقیدہ نہیں بلکہ اس سے مراد وہ زندہ چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں فکری انقلاب کہا جاتا ہے۔ شریعت کا حقیقی نفاذ اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ اس کے حق میں فکری و ذہنی انقلاب برپا کیا جا چکا ہو۔ پہلے انسان کے ذہن میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کے بعد ہی اس کے عمل میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ اسی طرح پہلے انسانی ذہن پر عقیدہ کا فکری غلبہ قائم ہوتا ہے، اس کے بعد یہ ممکن ہوتا ہے کہ شریعت کے قانونی نظام کو انسانی معاشرہ میں نافذ کیا جائے۔

قرآن جب اترنا شروع ہوا تو اس وقت عرب میں خالص شرعی اعتبار سے بہت سی بڑی بڑی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ مگر قرآن میں ان کے بارہ میں کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ ابتدائی دور کی تمام آیتیں اور سورتیں صرف ذہن کی تعمیر و تشکیل کے مضامین سے تعلق رکھتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر نبوت کے نصف سے زیادہ حصہ تک قرآن میں صرف وہ آیتیں اترتی رہیں جو انسان کے اندر تفکر و تدبر کی صلاحیتوں کو جگانے والی اور اس کے ذہن کو بدلنے والی ہوں۔ بقیہ تمام احکام کے نزول کو آئندہ کے لیے موخر کر دیا گیا۔

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ عمر نبوت کے نصف اول میں عقیدہ والی باتوں پر زور دیا گیا، اور عمر نبوت

کے نصف ثانی میں شریعت کے احکام نازل کیے گئے۔ گویا پہلے انسانی شاکلہ کی تصحیح کی گئی۔ اس کے بعد یہ حکم دیا گیا کہ فلاں فلاں قانون کو لوگوں کے اوپر جاری کرو۔

مزید یہ کہ تبدیلیٔ شاکلہ کا یہ عمل صرف مقامی طور پر نہیں بلکہ وہ عمومی اور عالمی سطح پر بھی مطلوب تھا، کیوں کہ جب تک عمومی سطح پر شاکلۂ انسانی میں تبدیلی نہ آئے، کسی مقامی دائرہ میں احکام شریعت کا نفاذ موثر طور پر نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے قرآن میں حکم دیا گیا کہ: وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله (الانفال ۳۹)

مفسرین نے یہاں فتنہ سے شرک مراد لیا ہے۔ یعنی ان سے لڑو یہاں تک کہ شرک باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لیے ہوجائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے تمام دنیا میں مشرکانہ شاکلہ (مشرکانہ طرزفکر) چھایا ہوا تھا۔ ان حالات میں مذکورہ حکم کا مطلب یہ تھا کہ ہر قسم کی کوشش کرکے لوگوں کے درمیان سے شاکلۂ شرک کا خاتمہ کردو، اور اس کی جگہ شاکلۂ توحید کو رائج کرو، تاکہ انھیں جس شریعت پر چلانا مطلوب ہے اس کی راہ ہموار ہوسکے۔

دور اول کی اسلامی تاریخ شریعت کی تطبیق کا مثالی نمونہ ہے۔ مثلاً قدیم عرب سماج میں زنا کا ارتکاب کثرت سے کیا جاتا تھا۔ مگر جب اسلام کے قانون زنا کو نافذ کیا گیا تو اس کے بعد پورے معاشرہ سے زنا کا خاتمہ ہوگیا۔ عدالت کے سامنے صرف چند مستثنیٰ کیس آئے جو نسبتاً بالکل ناقابل شمار ہیں۔ اسی طرح قدیم عربوں میں شراب کا عام رواج تھا۔ مگر جب شراب کی ممانعت کا قانون رائج کیا گیا تو یک لخت لوگوں نے شراب پینا ترک کردیا۔

دور اول میں شریعت کی یہ کامیاب تنفیذ کیسے ممکن ہوئی۔ جواب یہ ہے کہ وہ اس وقت ممکن ہوئی جب کہ عقیدہ کی سطح پر لمبی مدت تک عمل کرکے اس کے موافق ماحول بنالیا گیا۔ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت نہایت اہم ہے جو اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے۔

وہ کہتی ہیں کہ قرآن میں پہلے وہ سورتیں اتریں جن میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے تو حلال وحرام کے احکام اترے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ

زنا نہ کرو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے :

إنما نزلَ أولَ ما نزلَ منه سورة من المفصل فيها ذكرُ الجنةِ والنار۔ حتى إذا ثاب الناسُ إلى الاسلام نزلَ الحلال والحرامُ۔ ولو نزلَ اولَ شيءٍ لاتشربوا الخمرَ لقالوا لاندعُ الخمر ابداً۔ ولو نزل لا تزنوا لقالوا لاندعُ الزنا ابداً (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت واضح طور پر تطبیق شریعت کے لیے عقیدہ کی اہمیت کو بتاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تطبیق شریعت کا صحیح طریقہ تدریج کا طریقہ ہے۔ یعنی پہلے لوگوں کے اندر فکری تبدیلی پیدا کی جائے۔ اس کے بعد ان کے اوپر احکام کی تنفیذ عمل میں لائی جائے۔ اسی تدریجی طریقہ کو اختیار کر کے دور اول میں کامیابی حاصل کی گئی، اور اسی تدریجی طریقہ کی پیروی کر کے بعد کے زمانوں میں بھی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مسلم ملکوں میں تطبیق شریعت کی کوششیں کی گئیں، مگر سب کی سب اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کوششوں میں مذکورہ تدریجی اصول کو اختیار نہیں کیا گیا۔ ان مثالوں میں فکری انقلاب لائے بغیر شرعی احکام کو نافذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور ایسی کوشش کا انجام ہمیشہ وہی ہوگا جس کا ذکر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں کیا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ جدید تہذیب نے پوری دنیا کے سوچنے کے انداز کو بدل دیا ہے۔ نہ صرف عام انسان بلکہ خود مسلمان بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اس سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ ایسی حالت میں شریعت کے نفاذ کا کام وقت کی فکری فضا کو بدلنے سے شروع ہوگا نہ کہ قانونی احکام کو نافذ کرنے سے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں کچھ مسلم ملکوں کا موجود ہونا ہی تطبیق شریعت کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اس کے لیے انسانی شاکلہ میں ضروری تبدیلی لانا بھی ناگزیر طور پر مطلوب ہے۔ اگر عالمی انسانی شاکلہ ہمارے موافق نہ ہو تو کسی مسلم ملک میں تطبیق شریعت کا جزیرہ تعمیر کرنا ممکن نہ ہوگا۔ پچھلے ایک سو سال کے درمیان مختلف مسلم ملکوں میں نفاذ شریعت کی کوششوں کے ناکام ہونے کا اصل سبب یہی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے تمام دنیا میں مشرکانہ شاکلہ کا غلبہ تھا۔ یہی وہ صورت حال تھی جس کو ابراہیم علیہ السلام نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا تھا کہ : رب انھن اضللن کثیرا من الناس (ابراہیم ۳۶) یعنی ان اصنام نے بشیتر لوگوں کو بہکا کر مشرکانہ عقیدہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ اور وہ توحید کی فکر سے ہٹ گئے ہیں۔

ان حالات میں رسول اور اصحاب رسول کو حکم دیا گیا کہ مشرکانہ تہذیب کے خلاف جہاد کریں اور اس وقت تک اپنا جہاد جاری رکھیں جب کہ مشرکانہ طرز فکر کا غلبہ دنیا سے ختم ہو جائے۔ انھوں نے اپنی غیر معمولی جدوجہد اور بے پناہ قربانیوں کے ذریعہ مشرکانہ ذہن کو توڑ دیا۔ جو لوگ غیر اللہ کی بنیاد پر سوچتے تھے وہ اللہ کی بنیاد پر سوچنے لگے۔ یہ مشرکانہ شاکلہ پہلے عرب میں توڑا گیا۔ اس کے بعد فکری انقلاب کا یہ سیلاب آگے بڑھا اور ایشیا اور افریقہ سے گزرتا ہوا وہ یورپ کے اندر داخل ہو گیا۔

بعثت نبوی کے سو سال کے اندر یہ واقعہ ہوا کہ عالمی سطح پر مشرکانہ شاکلہ مغلوب ہو گیا اور موحدانہ شاکلہ زمین کے اوپر چھا گیا۔ انسانی نسل کی ایک تعداد پوری طرح اس سے تائب ہو کر دین توحید کے دائرہ میں داخل ہو گئی۔ بقیہ تعداد اگرچہ اسلام میں باقاعدہ داخل نہیں ہوئی، تاہم اس کے درمیان بھی شرک کی حیثیت غالب فکر کی نہیں رہی۔ ہنری پرین (Henri Pirenne) نے اس انقلابی واقعہ کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے :

> Islam changed the face of the globe.
> The traditional order of history was overthrown.

اسلام کے ظہور کے بعد تقریباً ایک ہزار سال تک یہ شاکلۂ توحید دنیا میں قائم رہا۔ اس کے بعد جدید سائنسی اور صنعتی انقلاب آیا۔ اس نے پوری صورت حال کو دوبارہ بدل دیا۔ اب اگرچہ سابق مشرکانہ شاکلہ تو واپس نہیں آیا۔ مگر جدید مغربی تہذیب کے اثر سے یہ ہوا کہ موحدانہ شاکلہ یا خدا پرستانہ طرز فکر مغلوب ہو گیا، اور اس کی جگہ ایک اور شاکلہ نے غالب شاکلہ کا درجہ حاصل کر لیا۔ اس نئے شاکلہ کو ملحدانہ شاکلہ کہا جا سکتا ہے۔

یہی موجودہ زمانہ کا اصل مسئلہ ہے۔ اسلام کے ظہور کے وقت اگر مشرکانہ شاکلہ کو مغلوب کرنے کا مسئلہ تھا تو اب داعیان اسلام کے لیے پہلا کام یہ بن گیا ہے کہ وہ ملحدانہ شاکلہ کو توڑیں۔

اس ابتدائی شرط کو پورا کیے بغیر تطبیق شریعت کے مقصد کا حصول ممکن نہیں۔

اسلام ایک محفوظ دین ہے۔ اللہ نے اس کی ابدی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ اس لیے تاریخ میں کوئی بھی ایسی صورت حال پیش نہیں آسکتی جو اسلام کے مواقع کو مستقل طور پر مسدود کر دے۔ چنانچہ موجودہ زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خصوصی نصرت سے ایسے امکانات پیدا کیے جن کو استعمال کر کے اہل اسلام دوبارہ تاریخ کے رخ کو موڑ دیں، وہ بے خدا شاکلہ کو مغلوب کر کے دوبارہ خدا پرستانہ شاکلہ کو دنیا میں فکری اعتبار سے غالب کر دیں۔ اور اس طرح از سر نو تطبیق شریعت کی راہ ہموار کر سکیں۔

دور جدید میں ہمارے لیے جو موافق امکانات پیدا ہوئے ہیں وہ بے شمار ہیں۔ مثلاً جدید وسائل اعلام جنھوں نے تاریخ میں پہلی بار اس کو ممکن بنایا ہے کہ ہر بیت مدر اور ہر بیت وبر تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا جائے۔ اسلام کے سوا دوسرے تمام مذاہب کا خالص علمی اور تاریخی معیار پر غیر معتبر ثابت ہو جانا۔ جدید سائنسی حقائق کا ظہور جو تعلیمات اسلام کی معجزاتی تصدیق کرنے والے ہیں۔ انسانی ساخت کے نظریہ ہائے حیات کی مکمل ناکامی، وغیرہ۔ یہاں ہم صرف آخری نوعیت کی دو مثالیں نقل کرتے ہیں۔

نیوٹن کے زمانہ سے خدا پرستانہ شاکلہ بدلنا شروع ہوا۔ تقریباً تین سو سال تک انسان اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ وہ مادی سائنس کو مذہب کا بدل بنا سکتا ہے۔ اس دور میں بہت بڑے پیمانہ پر یہ کوشش کی گئی کہ انسان اور کائنات کی تشریح مادہ کی اصطلاحات میں کی جاسکے۔ مگر یہ کوشش مکمل طور پر ناکام ہو گئی۔ بہترین دماغوں کی طویل محنت کے بعد آخر کار معلوم ہوا کہ کائنات مادی تشریح کو قبول کرنے سے انکار کر رہی ہے۔

اس صورت حال کا اعتراف مختلف سائنس دانوں نے مختلف انداز سے کیا ہے۔ نظریاتی طبیعیات کے مشہور عالم اروِن شروڈنگر (۱۹۶۱ – ۱۸۸۷) نے سائنس کی اس ناکامی کا اقرار ان الفاظ میں کیا کہ فطرت کے بارہ میں سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے:

The most incomprehensible thing about nature is that it is comprehensible.

سائنس داں کے اس قول کا مطلب خود کائنات کے ناقابل فہم ہونے کو بتانا نہیں ہے۔ بلکہ اس کی مادی تشریح کی نارسائی کو بتانا ہے۔ اس کے الفاظ کو بدل کر اگر اصل مفہوم کے اعتبار سے اس کو بیان کیا جائے تو وہ یہ ہوگا کہ ـــــــ کائنات کی تشریح اگر خدائی بنیاد پر کی جائے تو وہ قابل فہم نظر آئے گی مگر وہ ہم کو مطلوب نہیں۔ اس کے برعکس ہم کائنات کی تشریح خدا کو حذف کر کے کرنا چاہتے ہیں مگر اس طرح کائنات قابل فہم نہیں بنتی۔

یہ ہے وہ مقام جہاں آج فکر جدید کھڑا ہوا ہے۔ فکر جدید نے خدا کا براہ راست اعتراف نہیں کیا۔ تاہم بالواسطہ پر وہ یہ اقرار کر رہا ہے کہ خدا کو فکری بنیاد بنائے بغیر کائنات کے ظاہرہ کو سمجھا نہیں جاسکتا۔ اس صورت حال نے ہمارے لیے کام کو بہت آسان کر دیا ہے۔ جدید انسان خود اپنی تحقیق کے نتیجہ میں لاالٰہ کے مقام پر پہنچ چکا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ اس کو الا اللہ کی حقیقت سے متعارف کرایا جائے۔

دوسری چیز جس کا میں حوالہ دینا چاہتا ہوں وہ سوویت یونین کا سقوط ہے۔ سوویت یونین کا سقوط صرف ایک ایمپائر کا سقوط نہیں ہے۔ یہ واقعہ اس سے کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ سوویت یونین کے سقوط سے پہلے دنیا کے پاس اشتراکیت کی صورت میں زندگی کی ایک آئیڈیالوجی تھی۔ یہ اگرچہ ایک فرضی آئیڈیالوجی (false ideology) تھی۔ تاہم وہ دنیا کے ایک بڑے طبقہ کو اس غلط فہمی میں ڈالے ہوئے تھی کہ اس کے پاس ایک آئیڈیالوجی ہے اور اس کے ذریعہ وہ انسانی تاریخ کی اور کائنات کی تشریح کر سکتا ہے۔ مگر سوویت یونین کے سقوط نے اس بھرم کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

اب ساری جدید دنیا میں ایک نظریاتی خلا (ideological vacuum) پیدا ہو گیا ہے۔ اب اسلام کے سوا کوئی نظریہ میدان میں نہیں۔ گویا کہ اس صورت حال نے اسلام کو بلامقابلہ کامیابی (unopposed victory) کی پوزیشن میں پہنچا دیا ہے۔ اگر اہل اسلام اس پیدا شدہ صورت حال کو واقعی طور پر استعمال (avail) کریں تو کم مدت کی محنت سے شاکلۂ انسانی کو دوبارہ دین توحید کے موافق بنایا جاسکتا ہے۔

آج کل کثرت سے ایسی رپورٹیں اور کتابیں چھپ رہی ہیں جن میں اکیسویں صدی کے بارہ میں اندازے کیے جا رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ آنے والی صدی جاپان کی صدی ہوگی۔ کوئی اس کو یورپ یا امریکہ کی صدی بتاتا ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آنے والی صدی اسلام کی صدی ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ یا جاپان یا امریکہ کے پاس جو کچھ تھا، اس کو وہ آخری حد تک ظاہر کر چکے۔ ان ملکوں کے پاس انسان کی مادی ترقی کا پروگرام تھا۔ اس پروگرام کو وہ آخری حد تک عمل میں لا چکے ہیں۔ مگر مادی ترقیات کے آخری کنارے پر کھڑا ہوا جدید انسان محسوس کر رہا ہے کہ اس کی فطرت مزید کسی چیز کی طالب ہے، اور ان مادی ترقیوں میں وہ چیز موجود نہیں۔

یہ مزید چیز بلاشبہ نظریۂ حیات ہے۔ انسان جس نوعیت کی مخلوق ہے، وہ صرف مادی سامان پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ اس کو اپنی زندگی کے لیے ایک فکری توجیہہ بھی لازمی طور پر درکار ہے۔ یہ فکری توجیہہ یا یہ نظریۂ حیات اس کو اسلام کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔ یہی واقعہ اس بات کا اشارہ کر رہا ہے کہ آنے والی صدی کے لیے مقدر ہے کہ وہ اسلام کی صدی بنے۔ تاہم اسلام کی صدی اپنے آپ نہیں آئے گی۔ اس امکان کو واقعہ بنانے کے لیے صحیح انداز پر جدوجہد کرنا ضروری ہے۔

اس میدان میں جو لوگ کام کرنے کے لیے اٹھیں، ان کو جاننا چاہیے کہ انھیں اپنے کام کو اصولی طور پر دو مرحلوں میں تقسیم کرنا ہے۔ پہلے مرحلہ میں ان کا بنیادی نشانہ دعوت ہوگا۔ یعنی جدید مواقع کو استعمال کرتے ہوئے موثر انداز میں اسلام کا تعارف کرنا، انسانی نسل کو دوبارہ توحید کی بنیاد پر قائم کرنا۔ اس ابتدائی کام کو ضروری حد تک انجام دینے کے بعد وہ وقت آئے گا جب اسلام کے قانونی اور اجتماعی احکام کو عملی طور پر نافذ کیا جائے۔ اس معاملہ میں انھیں الاقدم فالاقدم کے اصول پر عمل کرنا ہے۔ یہی اسلام کا تقاضا ہے، اور یہی عقل کا تقاضا بھی۔

اسلام میں عدل اجتماعی

رانچی (بہار) کے لاکالج میں ۱۴ دسمبر ۱۹۹۱ کو مسٹر جسٹس ستیشور رائے کی زیر صدارت تعلیم یافتہ افراد کا ایک اجتماع ہوا۔ اس میں میں نے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا : اجتماعی عدل اسلام میں (Social justice in Islam) ذیل میں اس کو کسی قدر اضافہ کے ساتھ درج کیا جاتا ہے۔

سوشل جسٹس کا مطلب سادہ طور پر سب کے لیے انصاف (justice to all) ہے۔ اسلام سے پہلے انسانی سماج میں اس قسم کا مساویانہ انصاف نظری اور عملی دونوں اعتبار سے تقریباً معدوم تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار مساویانہ انصاف کو قائم کیا۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جس کا اعتراف خود غیر مسلم مفکرین نے کیا ہے۔ مثال کے طور پر سوامی ویویکانند (۱۹۰۲-۱۸۶۳) نے اپنے خطوط (Letters) میں کہا ہے کہ اگر کبھی کوئی مذہب انسانی برابری تک قابل لحاظ درجہ میں پہنچا ہے تو وہ اسلام اور صرف اسلام ہے :

> If ever any religion approached to this equality in any appreciable manner, it is Islam and Islam alone. (p.379)

اس معاملہ میں اسلام کا جو حصہ (contribution) ہے، وہ ایک نہایت تفصیلی کتاب کا طالب ہے۔ تاہم اصولی طور پر اس کو تین باب میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ انسانی برابری اور مساوی انصاف کے حق میں ایک مکمل نظریہ (ideology) پیش کرنا۔ اس قسم کا ایک نظریہ انتہائی ضروری ہے۔ نیز اس نظریہ کو لازمی طور پر حقیقی بھی ہونا چاہیے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں جو نظریہ پیش کیا ہے اس میں یہ دونوں صفتیں پوری طرح پائی جاتی ہیں۔

۲۔ اس نظریہ کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کے لیے ایک طاقتور محرک (incentive) دینا۔ یہ محرک اتنا گہرا ہونا چاہیے کہ وہ مساوات برتنے اور سماجی انصاف کرنے کو ہر آدمی کا ذاتی مسئلہ بنا دے۔ اس کے بعد ہر آدمی خود اپنی فلاح کے لیے اس کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے۔

۳۔ ہر شعبۂ حیات میں برابری اور مساوی انصاف کا ایک حقیقی نمونہ (example) قائم کرنا۔ اگر ایسا نمونہ واقعہ میں موجود نہ ہو تو لوگ برابری کے سلوک کی بات کو صرف ایک خیالی چیز سمجھیں گے،

وہ اس کو قابل عمل سمجھنے پر کبھی آمادہ نہ ہوں گے۔

مساوی انصاف کا نظریہ

قدیم ترین زمانہ سے اونچ نیچ کے نظریات ہر جگہ پائے جاتے رہے ہیں۔ اور اس بنا پر ہر دور میں سماجی ناانصافی کا عمل بھی جاری رہا ہے۔ قدیم زمانہ کا کوئی بھی دور اس سے خالی نظر نہیں آتا۔ یہ ایسا کلیہ ہے جس میں معلوم تاریخ کے مطابق، کوئی استثنا نہیں۔

قدیم یونان مفکرین اور مصلحین کی پیدائش کے لیے مشہور ہے۔ مگر قدیم یونان کے مشہور فلسفی ارسطو کا خیال تھا کہ کچھ لوگ پیدائشی طور پر غلام (natural slaves) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگرچہ بعض مفکرین نے اس سے اختلاف کیا۔ تاہم ان کا اختلاف بے اثر ثابت ہوا۔ اور غلامی عملی طور پر یونان اور روم میں وسیع پیمانہ پر مسلسل جاری رہی:

Aristotle regarded some humans as natural slaves a point on which later Roman philosophers especially the stoics and jurists, disagreed with him. Although slavery was as widespread in Rome as in Greece. (5/93)

یہی حال قدیم زمانہ میں ساری دنیا کا رہا ہے۔ انڈیا میں ہزاروں برس سے یہ نظام قائم تھا کہ کچھ لوگ اونچی ذات والے ہیں اور کچھ لوگ نیچی ذات والے۔ اونچی ذات والوں کو حق تھا کہ وہ نیچی ذات والوں کے ساتھ ہر قسم کا غیر مساوی سلوک کریں۔ بھارتی فکر میں یہ غیر مساوی تصور اتنا راسخ ہے کہ موجودہ زمانہ میں نئے قوانین بنائے جانے کے باوجود یہ تفریق نہ عملی طور پر ختم ہو سکی اور نہ فکری طور پر۔

یورپ کے لوگوں نے دیکھا کہ وہ سفید فام ہیں اور افریقہ کے لوگ سیاہ فام۔ انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ سفید لوگ پیدائشی طور پر اونچے لوگ ہیں اور سیاہ فام لوگ پیدائشی طور پر نیچے لوگ۔ سفید فام کو جائز طور پر یہ حق ہے کہ وہ سیاہ فام کو غلام بنائے اور ان سے اپنی خدمت لے۔

افریقہ کو سیاہ براعظم (dark continent) قرار دیا گیا۔ جغرافی ذرائع اور انسانی صلاحیت کے اعتبار سے افریقہ یکساں طور پر ایک قیمتی زمینی خطہ تھا۔ مگر یہاں کے لوگوں کی جلد کا رنگ چونکہ سیاہ تھا، وہ پیدائشی طور پر کمتر مان لیے گئے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یورپ میں یہ ذہن پیدا ہوا کہ

نیگرو پیدائشی غلام ہیں۔ یہ ابتدائی دور کے لوگ ہیں اور تہذیب کو اختیار کرنے کے لیے نااہل ہیں :

The negro is a natural slave. The Europeans regarded the African as primitive without culture and incapable of civilisation. Slave Trade in Africa, 1985, p.7

نسلی بادشاہت کے نظام میں شاہی خاندان والوں نے اپنے آپ کو آقا سمجھ لیا اور دوسروں کو رعایا۔ ان کا خیال یہ ہوگیا کہ انھیں دوسروں کے اوپر پیدائشی فضیلت حاصل ہے۔ اور ان کو مطلق طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کے اوپر حکومت کریں اور دوسروں پر لازم ہے کہ وہ ان کے آگے جھک جائیں۔ تمام قدیم زمانوں میں بادشاہ یا تو خدا سمجھے جاتے تھے یا خدا کے نمائندہ (God's representative) عوام کی یہ لازمی ذمہ داری تھی کہ وہ ہر حال میں بادشاہ کے مطیع اور فرماں بردار بنے رہیں (V/816)

اسی طرح دولت مند لوگوں نے اپنے آپ کو حقوق یافتہ طبقہ (privileged class) سمجھ لیا اور غریب لوگوں کو محروم طبقہ (deprived class) قرار دیا۔ جس آدمی کے پاس دولت آجائے وہ گویا ایک علامت تھی کہ وہ خدا کی عنایت و رحمت سے فیض یاب ہوا ہے۔ اور جس آدمی کو دولت نہ ملے وہ گویا ایک ایسا شخص ہے جس کو خدا نے اپنی عنایتوں سے دور کر دیا۔

سماجی ناانصافی کے یہ تمام نظریات اس لیے پیدا ہوئے کہ لوگوں نے انسان اور انسان کے درمیان فرق دیکھا۔ یہ بجائے خود ایک حقیقت ہے کہ ایک انسان اور دوسرے انسان، ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان ظاہری اعتبار سے مختلف قسم کے فرق پائے جاتے ہیں۔ مثلاً رنگ کا فرق، جسمانی بناوٹ کا فرق، دولت اور طاقت کا فرق، وغیرہ۔ اسی فرق کی غلط توجیہہ نے مذکورہ تمام امتیازات اور بے انصافیوں کو پیدا کیا ہے۔

سماجی نابرابری کا تصور تاریخ میں مسلسل پایا گیا ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فروق (differences) کو پیدائشی (inborn) سمجھ لیا گیا۔ مختلف قسم کے نظریے اور فلسفے وجود میں آئے جو انسانوں کے درمیان فرق کا کوئی نہ کوئی ایسا سبب بتاتے تھے جس کا تعلق پیدائش سے ہوتا تھا۔ فرق کی یہی مبنی بر پیدائش توجیہات (birth-based explanations) وہ نظریاتی سبب ہیں جنھوں نے "پائے ہوئے" لوگوں کو یہ جواز دیا کہ وہ "کھوئے ہوئے" لوگوں کو برابری کا درجہ اور

برابری کا انصاف دینے سے انکار کرسکیں۔

مثلاً ہندستان میں اس فرق کو دیکھ کر ورن کا عقیدہ پیدا ہوا۔ ورن کے لفظی معنی رنگ کے ہوتے ہیں۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک انسان اور دوسرے انسان کے رنگ میں فرق ہے، اس سے انھوں نے یہ اخذ کیا کہ ایک قسم کے رنگ والے خدا کے سر سے پیدا ہوئے ہیں اور دوسرے قسم کے رنگ والے خدا کے پاؤں سے :

Indian society is made up of four different varnas. The Rigveda (10.90) has declared that the Brahmin, the Ksatriya, the Vaisya, and the Sudra issued forth at creation from the mouth, arms, thighs and feet of Purusa. (X/361)

یورپ میں نسلی امتیاز کا نظریہ (racism) پچھلی صدیوں میں شدت کے ساتھ پھیلا۔ اور اب تک وہ کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ ابتداءً یہ ذہن اس لیے پیدا ہوا کہ اہل یورپ نے اپنے اور دوسروں کے درمیان رنگ اور کلچر میں فرق پایا۔ اس سے انھوں نے یہ نظریہ قائم کرلیا کہ وہ دوسروں سے برتر (superior) ہیں اور دوسرے لوگ ان سے کمتر (inferior)

موجودہ زمانہ میں نظریۂ ارتقاء کے ظہور نے اس کو مزید پختہ کر دیا۔ کیوں کہ سماجی ڈاروینیت (Social Darwinism) کے تحت یہ سمجھ لیا گیا کہ انسانیت مختلف ارتقائی مرحلوں سے گزری ہے اور مغربی تہذیب اس کا درجۂ کمال ہے :

Mankind was regarded as having achieved various levels of evolution, culminating in the white-European civilization. (15/363)

اس کے مطابق، یورپ کے سفید فام لوگ ارتقاء یافتہ نسل قرار پائے اور دوسرے غیر سفید فام طبقے عملِ ارتقاء میں پیچھے رہ جانے والے لوگ۔

قدیم زمانہ میں نسلی فرق کے بارہ میں توہماتی نظریات کی بنا پر امتیاز کا ماحول پیدا ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء نے بظاہر اس امتیاز کے حق میں ایک علمی بنیاد فراہم کر دی۔ کیوں کہ اس نے بتایا کہ بہت سے انسانی گروہ ارتقائی عمل میں دوسروں سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ کچھ گروہ عملِ ارتقاء میں اعلیٰ (superior) ہو گئے اور کچھ دوسرے گروہ پچھڑ کر ارتقاء کے ابتدائی مرحلہ

(primitive stage) میں پڑے رہے۔

اس ارتقائی نظریہ کی بنا پر یورپی قوموں نے دوسری قوموں کو اپنے سے کمتر سمجھ لیا۔ اس کے نتیجہ میں سفید فام کی ذمہ داری (whiteman's burden) کا نظریہ پیدا ہوا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سفید فام اقوام کو یہ حق ہے کہ وہ دنیا پر قبضہ کریں اور ان کے اوپر تہذیب کی معلم بنیں۔ موجودہ دور کے نوآبادیاتی نظام (colonialism) کے پیچھے بھی ارتقائی منطق کام کرتی رہی ہے۔

یہ تصورات کسی نہ کسی طور پر آج تک قائم ہیں۔ آج کی دنیا کو وسیع تقسیم میں دو حصوں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ روایتی دنیا اور سائنٹفک دنیا۔ بظاہر ایک غیر ترقی یافتہ ہے اور دوسری ترقی یافتہ۔ مگر سماجی بے انصافی کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں ہی ایسے عقائد پر مبنی ہیں جو سماجی انصاف کے راستہ میں مستقل رکاوٹ ہیں۔

روایتی دنیا بڑی حد تک "کرم" کا عقیدہ ماننے والوں کی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر آدمی جو پیدا ہوا ہے وہ پچھلے کرموں کا بوجھ لیے ہوئے ہے۔ یہ نیچر کا قانون ہے اور آدمی کو بہر حال اسے بھگتنا ہے۔ اس عقیدہ کی روشنی میں سماجی انصاف کا محرک بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس عقیدہ کے مطابق، جس چیز کو ہم "ناانصافی" کہتے ہیں وہ ناانصافی نہیں رہتی بلکہ وہ آدمی کے اوپر نیچر کا نافذ کردہ لازمی فیصلہ ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم اس کو اس کی ناپسندیدہ حالت سے نکال سکیں۔ پھر انصاف کے قیام کا جذبہ آخر کیوں کر پیدا ہو گا۔

سائنٹفک دنیا اسی عقیدہ میں ایک اور سبب سے مبتلا ہے۔ یہ ارتقاء (evolution) کا نظریہ ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ زندگی کی مختلف انواع (species) کی توجیہہ کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کو "فرق" کی توجیہہ بھی کرنی پڑی۔ چنانچہ علماء ارتقاء نے یہ نظریہ بنایا کہ ارتقاء کے عمل میں کچھ انسانی گروہ آگے بڑھ گئے اور کچھ لوگ پیچھے رہ گئے۔ مثال کے طور پر، عورت کے بارہ میں ڈارون کا کہنا ہے کہ وہ ارتقاء کے عمل کے دوران ابتدائی درجہ پر باقی رہ گئی۔ مرد آخر کار عورت کے اوپر فائق ہو گیا:

Man has ultimately become superior to woman.

افریقہ کے سیاہ فام یا بعض علاقوں کے پستہ قد لوگ وہ انسانی نسلیں ہیں جو ارتقائی عمل میں دوسروں سے پیچھے رہ گئیں۔ اس طرح سائنٹفک دنیا بھی، اپنے اس عقیدہ کے مطابق، مفروضہ پچھڑی

ہوئی نسلوں کے بارہ میں ہمدرد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کا عقیدہ اس کے اندر جو مزاج پیدا کرتا ہے وہ یہی ہے۔

اس قسم کے مفروضات کی بنیاد پر وہ نظریہ نکلا جس کو ان کی اپنی غلطی (Their own fault) کہا جاتا ہے۔ یعنی جو لوگ کسی دوسرے کی طرف سے نابرابری کے سلوک کا تجربہ کر رہے ہیں وہ خود ان کی اپنی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ گویا کہ ظلم مظلوم کی اپنی تقدیر ہے۔ اس کے لیے ظالم قصوروار نہیں (15/363)

اسلام آیا تو اس نے مکمل طور پر اس قسم کے تمام نظریات کو منہدم کر دیا۔ اسلام نے مسلسل مختلف طریقوں سے یہ تصور پیش کیا کہ ظاہری فرق کے باوجود تمام انسان برابر ہیں۔ سب کو یکساں عزت اور انصاف کا حق حاصل ہے۔ کوئی انسان نہ کسی سے برتر ہے اور نہ کوئی انسان کسی سے کمتر۔ یہاں اس سلسلہ میں دو حوالے نقل کیے جاتے ہیں۔ قرآن میں اعلان کیا گیا ہے :

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ ان اللہ علیم خبیر (الحجرات ۱۳)	اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ اور تم کو قوموں اور خاندانوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا، خبر رکھنے والا ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، انسانوں میں رنگ اور نسل کا جو فرق ہے وہ تعارف کے لیے ہے نہ کہ امتیاز کے لیے۔ انسان اپنی اصل کے اعتبار سے سب کے سب ایک ہیں۔ ان میں امتیاز کی بنیاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف کیرکٹر ہے۔ قابل عزت وہ ہے جو خدا پرست ہے۔ جو خدا اور بندوں کے حقوق کو پہچانتا ہے اور ان کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ دیا۔ آپ ایام تشریق میں اپنے اونٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس وقت آپ نے جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک بات یہ تھی :

یا ایھا الناس ألا إن ربکم واحد وإن اباکم واحد۔ ألا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی	اے لوگو سن لو، بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ سن لو کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی

ولا لاسود علی احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی۔ الا ھل بلغت۔ قالوانعم۔ قال فلیبلغ الشاھد الغائب (الجامع لاحکام القرآن ۱۶/ ۳۴۲)

فضیلت نہیں۔ اور کسی کالے کو کسی سرخ پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ جو کچھ فضیلت ہے تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ کیا میں نے تم کو پہنچا دیا۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے فرمایا کہ جو حاضر ہے وہ غیر حاضر کو یہ بات پہنچا دے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان اپنی عمر کے آخری سال کیا تھا۔ اس وقت پورا عرب فتح ہو چکا تھا۔ اس لیے آپ کا یہ اعلان محض ایک مصلح کا اعلان نہ تھا، بلکہ حاکم وقت کا اعلان تھا۔ یہ اعلان نہ صرف ایک اصولِ مساوات کے طور پر سنا گیا بلکہ عین اسی وقت وہ بالفعل قائم اور نافذ بھی ہو گیا۔

اس اعلان کے مطابق، آپ نے تمام لوگوں کو بتایا کہ اس دنیا کا جس طرح خالق ایک ہے۔ اسی طرح تمام انسان ایک ہی باپ اور ماں سے پیدا ہوتے ہیں۔ تمام انسان ایک ہیں۔ تمام انسان آپس میں بھائی اور بہن ہیں۔ ان میں ظاہری اعتبار سے فرق ہو سکتا ہے مگر عزت اور احترام اور قانونی انصاف کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

جہاں تک انسانوں میں ظاہری درجات کا تعلق ہے، اسلام نے بتایا کہ یہ درجات آزمائش کے لیے ہیں نہ کہ امتیاز کے لیے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تمام انسانوں کو امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ کسی انسان کو جو سامان یا جو حیثیت ملتی ہے وہ اس کے لیے سامانِ آزمائش ہے، وہ گویا اس کے لیے امتحان کا پرچہ ہے۔ اس دنیا میں کمی بھی ایک امتحانی حالت ہے اور زیادتی بھی ایک امتحانی حالت۔ ایک حیثیت بھی امتحان کے لیے ہے اور دوسری حیثیت بھی امتحان کے لیے۔ اس لیے آدمی کو ساری نظر اس پر رکھنا چاہیے کہ وہ اپنے امتحان میں پورا اتر رہا ہے یا نہیں۔ نہ کہ اپنی حالت کو دیکھ کر وہ احساسِ کمتری یا احساسِ برتری میں مبتلا ہو جائے (الفجر)

سائنسی تصدیق

موجودہ زمانہ میں انسانی نسلوں کے بارہ میں جو نئی نفسیاتی اور حیاتیاتی تحقیقات ہوئی ہیں انھوں نے اسلام کی واضح تصدیق کی ہے اور دوسرے نظریات کو خالص علمی اعتبار سے رد کر دیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مالے کیولر بیالوجی (Molecular biology) نے تحقیق کا نیا میدان

کھول دیا ہے۔ چنانچہ امریکہ میں جینیٹکس کے ماہرین کی ایک ٹیم نے باقاعدہ ریسرچ کے ذریعہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ وہ انسانیت کے مشترک جد اعلیٰ (common ancester) کو دریافت کریں۔

اس ٹیم نے جینی شہادت (Genetic evidence) کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تمام انسانوں کے جد اعلیٰ ایک تھے۔ رنگ وغیرہ کا فرق جو بظاہر دکھائی دیتا ہے وہ محض اضافی ہے۔ اس کا نسلی علٰحدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے مطابق تمام انسان ایک عظیم خاندان (Great family) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تمام لوگ ایک ہی حیاتیاتی اخوت (biological brotherhood) کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں (نیوز ویک ۱۱ جنوری ۱۹۸۸)

اس موضوع پر موجودہ زمانہ میں کثرت سے کتابیں اور تحقیقی مقالات شائع ہوئے ہیں۔ یونیسکو کے زیر اہتمام ایک کتاب چھپی ہے جو کہ حسب ذیل ہے :

J Comas, The Race Question in Modern Science, 1956.

اس کتاب کا باب نسلی توہمات (Racial Myths) اس ضمن میں خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے۔

محرک کا مسئلہ

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ان علمی تحقیقات کے باوجود ایسا کیوں ہے کہ دنیا کی عملی صورت حال میں کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا۔ جن قوموں نے اپنے کو اعلیٰ سمجھ لیا تھا، وہ آج بھی اپنے کو اعلیٰ سمجھے ہوئے ہیں۔ اور ان قوموں کے ساتھ نئی نئی صورتوں میں ناانصافی کی جارہی ہے جن کو قدیم تصور کے تحت کمتر سمجھ لیا گیا تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سماجی انصاف کے معاملہ میں صرف ایک نظریہ کا پایا جانا کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ ایک طاقت ور محرک کا ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ اور طاقت ور محرک اسلام کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔ اسلام نے جس طرح ایک کامل نظریہ دیا ہے، اسی طرح وہ اس معاملہ میں ایک انتہائی طاقت ور محرک بھی انسان کو دیتا ہے۔

قرآن میں ایک طرف عدل کا حکم دیا گیا ہے (النحل ۹۰) اور دوسری طرف مکافات عمل کا نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ خبر دی گئی ہے کہ انسان کے تمام اعمال کی مکمل ریکارڈنگ کی جارہی ہے۔ موت کے بعد ہر آدمی اللہ کی عدالت میں کھڑا کیا جائے گا۔ وہاں ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ کوئی

بھی شخص ، اگر وہ ظلم کرتا ہے تو وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا ۔ وہ وقت بہر حال آنا ہے جب کہ ہر آدمی اپنے کیے کا انجام بھگتے ، خواہ اس نے ایک ذرہ کے برابر ظلم کیوں نہ کیا ہو (الزلزال)

یہ مسئولیت (accountability) کا نظریہ آدمی کو آخری حد تک چوکنا کر دیتا ہے ۔ یہ فکر جس کے سینہ میں جاگ جائے وہ انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں سخت محتاط ہو جاتا ہے ۔ وہ خود اپنے بچاؤ کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ ہر ایک ساتھ انصاف کرے ۔ وہ لوگوں کے ساتھ زیادتی کرنے سے پوری طرح اپنے آپ کو بچائے ۔

عام حالات میں سماجی انصاف محض دوسروں کی ضرورت رہتا ہے ۔ مگر مسئولیت کا عقیدہ سماجی انصاف کو خود اپنی ضرورت بنا دیتا ہے ۔ اور کون ہے جو خود اپنی ضرورت کے بارہ میں غافل ہو جائے ۔

مسئولیت کا عقیدہ اتنا شدید چیک ہے کہ ظلم تو درکنار ، ظلم کے شائبہ سے بھی آدمی بچنے لگتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنی اہلیہ ام سلمہؓ کے حجرے میں تھے ۔ آپ نے کسی کام کے لیے خادمہ کو بھیجا ۔ وہ باہر گئی تو وہاں کھیل کود دیکھنے لگی اور واپسی میں دیر کر دی ۔ کافی دیر کے بعد وہ واپس آئی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی ۔ آپ کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے ۔ تاہم آپ نے خادمہ سے صرف یہ کہا کہ اگر مجھے قیامت میں بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا (لولا خشیۃ القود لاوجعتک بھذا السواک)

قدیم زمانہ میں خادم کو مارنا مالک کا فطری حق سمجھا جاتا تھا ۔ مگر اسلام نے جو ذہن بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غلطی کے باوجود مسلمان اپنے خادم کو مارنے سے احتراز کرتے تھے ۔ کیونکہ یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ان کا یہ فعل کہیں خود اپنی بازپرس کا سبب نہ بن جائے ۔

ایک صحابی ابومسعود انصاری ایک بار کسی غلطی پر اپنے غلام کو مارنے لگے ۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے ۔ آپ نے فرمایا کہ اے ابومسعود ، جان لو کہ جتنی قدرت تم کو اس غلام پر ہے ، اس سے زیادہ قدرت تمہارے اوپر خدا کو ہے (اعلم ابامسعود ، للّٰہ اقدر علیک منک علیٰ ھذا الغلام) یہ سنتے ہی ابومسعود کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا ۔ انھوں نے غلام سے کہا کہ جاؤ تم آزاد ہو ۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ظاہری فرق کو مٹا کر ہر آدمی کو عین اسی مقام پر کھڑا

کر دیتا ہے جہاں وہ دوسرے کو کھڑا ہوا پاتا ہے۔ ابومسعود اپنے اور غلام کے درمیان فرق دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بڑا اور طاقت ور سمجھ رہے تھے اور غلام کو چھوٹا اور کمزور۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حقیقت کی یاد دہانی کرائی تو ان کو معلوم ہوا کہ جہاں میں نے غلام کو کھڑا کر رکھا ہے وہیں میں خود بھی کھڑا ہوا ہوں کیونکہ اصل مقابلہ انسان اور انسان کا نہیں ہے بلکہ انسان اور خدا کا ہے۔ اور خدا کے مقابلہ میں میں بھی اتنا ہی چھوٹا ہوں جتنا چھوٹا کہ میں اپنے غلام کو سمجھ رہا ہوں۔

ایک اور دوسرے میں فرق کا احساس سماجی ناانصافی پیدا کرتا ہے۔ جب ایک اور دوسرے کا فرق مٹ جائے تو اس کے بعد سماجی ناانصافی کا بھی لازمی طور پر خاتمہ ہو جائے گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ظلم اور سماجی بے انصافی کے تمام واقعات انسانوں کے اندر نابرابری کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسانوں میں بظاہر کوئی طاقت ور ہوتا ہے اور کوئی کمزور، کوئی دولت مند ہوتا ہے اور کوئی غریب۔ اب طاقت ور اور دولت مند اپنے آپ کو کمزور اور غریب سے اونچا سمجھ لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے اوپر جو دست درازی چاہوں کروں، وہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میری برتر حیثیت اس کے مقابلہ میں ہر دفاع کے لیے کافی ہے۔

مگر اسلام بتاتا ہے کہ ہر انسان کا معاملہ خدا کا معاملہ ہے۔ ہر قضیہ آخر کار خدا کے سامنے پیش ہونے والا ہے۔ خدا تمام طاقت وروں سے زیادہ طاقت ور ہے۔ وہ کامل انصاف کے ساتھ ہر ایک کے اوپر اپنا فیصلہ نافذ کرے گا اور پھر کسی کے لیے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ خدا کے فیصلہ کی زد میں آنے سے اپنے آپ کو بچا سکے۔

اس طرح ہر معاملہ انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ نہ ہو کر خدا اور انسان کے درمیان کا معاملہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف تمام انسان۔ اور جب تقسیم خدا اور انسان کی ہو جائے تو کوئی بھی طاقت ور نہیں رہتا۔ ہر آدمی اپنے آپ کو اسی عجز کی حالت میں محسوس کرنے لگتا ہے جہاں اس سے پہلے وہ دوسرے کو فرض کیے ہوئے تھا۔

یہ بلاشبہ سماجی انصاف کا سب سے زیادہ طاقت ور محرک ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ احساس بیدار ہو جائے وہ کسی حال میں دوسرے کے اوپر ناانصافی کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایک ایسا معاشرہ جس میں خدا کو نہ مانا جاتا ہو وہاں اس قسم کا چیک ممکن نہیں۔ خدا کو نہ ماننے کی

صورت میں مسئلہ انسان اور انسان کے درمیان رہتا ہے۔ اور جب مسئلہ انسان اور انسان کے درمیان ہو تو کسی بھی طرح انسان کو اس پر مطمئن نہیں کیا جا سکتا کہ ایک اور دوسرے کے درمیان فرق نہیں ہے۔ کیونکہ فرق تو واقعہ میں موجود ہے اور پوری طرح موجود ہے۔

انسانوں کے درمیان فرق کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ فرق کے اثر کو ختم کیا جا سکتا ہے، اور وہ اس طرح کہ معاملہ کو انسان اور انسان کا معاملہ بنانے کے بجائے اس کو انسان اور خدا کا معاملہ بنا دیا جائے۔ ہر انسان یہ سمجھنے لگے کہ تمام انسانوں کے اوپر ایک خدا ہے اور تمام معاملات کو آخر کار اسی کے یہاں جانا ہیں۔ اس کے فیصلہ کو رد کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔

اسلام کے سوا دوسرے جن مذاہب میں خدا کا تصور ہے، وہ تحریف کی بنا پر عملاً اس مقصد کے لیے غیر موثر ہو گیا ہے۔ مثلاً مسیحیت میں خدا کا بیٹا سولی پر چڑھ کر تمام انسانوں کے گناہ کا کفارہ بن چکا ہے۔ یہودیت میں نجات ایک گروہ کا حق ہے جس کی بخشش پیشگی طور پر ہو چکی ہے۔ ہندوازم میں خدا کا عقیدہ وحدت الوجود (monism) کی صورت میں ہے۔ جو کہ عملاً بے فائدہ ہے۔

اسلامی توحید میں خدا علحدہ ہستی ہے اور تمام انسان اس کے بندے اور مخلوق ہیں۔ اس عقیدہ سے آدمی کے اندر عجز کا تصور ابھرتا ہے۔ اس کے برعکس ہندوازم میں خدا ہی واحد حقیقت ہے۔ انسان کوئی علحدہ وجود نہیں۔ انسان خود بھی خدا کے وسیع تر وجود کا ایک جزء ہے۔ یہ عقیدہ برعکس طور پر برتری کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسلامی توحید "میں بندہ ہوں" کا احساس جگاتی ہے، جب کہ ہندو عقیدہ "میں خدا ہوں" کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔ اول الذکر سے عجز کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور ثانی الذکر سے گھمنڈ کی نفسیات۔ اور جس سماج کے افراد اپنے اندر گھمنڈ کی نفسیات لیے ہوئے ہوں وہاں سماجی انصاف کا ماحول پیدا کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔

جدید تدبیروں کی ناکامی

۳۰ سال پہلے ایمنسٹی (Amnesty International) کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس کا ہیڈ کوارٹر لندن میں تھا۔ اس کو انسانی حقوق کا چوکیدار (Human rights watchdog) سمجھا جاتا تھا۔ مگر اس مدت میں وہ اخباری رپورٹوں کے سوا اور کوئی بھی حقیقی خدمت انجام نہ دے سکا۔ دسمبر ۱۹۹۱ میں اس کی عمر کے ۳۰ سال پورے ہو گئے مگر ادارہ کی طرف سے اس کی کوئی تقریب نہیں منائی گئی۔ ادارہ کی

خاتون نمائندہ فرینکا سیوٹو (Ms Franca Siuto) سے پوچھا گیا کہ آپ کا ادارہ ۲۰ سال پورے ہونے پر کیا کوئی تقریب منائے گا۔ انھوں نے کہا حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی بھی چیز تقریب منانے کے لیے نہیں :

There isn't really anything to celebrate.

ہر سال ۱۰ دسمبر کو اقوام متحدہ کی طرف سے "یوم حقوق انسانی" منایا جاتا ہے۔ اس سال اس موقع پر اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل جیویر پریزڈی کوئیار (Javier Peres de Cuellar) نے جو بیان جاری کیا، اس میں انھوں نے دنیا بھر میں طاقت کے اندھا دھند استعمال اور انسانوں کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ۴۳ سال پہلے اقوام متحدہ کے تحت منظور شدہ اعلان حقوق انسانی (یونیورسل ڈکلریشن آف ہیومن رائٹس) کے باوجود اب بھی بڑے پیمانہ پر اس کی خلاف ورزی کی جارہی ہے (نیشنل ہیرالڈ ۱۱ دسمبر ۱۹۹۱)

امن اور انصاف کے قیام میں ان اداروں کی ناکامی کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں امن اور انصاف اپیلوں یا اخباری بیانوں سے قائم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ اس کے موافق ایک صحیح آئیڈیالوجی ہو، اس آئیڈیالوجی کی بنیاد پر لوگوں کے اندر فکری انقلاب لایا جائے۔ پھر یہ اصلاح یافتہ لوگ سماجی اداروں کو درست کریں اور اگر حکومت ان کے قبضہ میں آجائے تو حکومت کے ذریعہ سماج کے اندر امن و انصاف قائم کریں۔

ان شرطوں کو تاریخ میں ایک ہی بار کامل طور پر پورا کیا گیا۔ یہ پورا کرنے والے پیغمبر اسلامؐ اور آپ کے اصحاب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امن و انصاف پر مبنی ایک حقیقی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اس قسم کی کامیابی نہ اس سے پہلے کسی کو ملی اور نہ اس کے بعد۔

مساویانہ انصاف کا نمونہ

سوشل جسٹس کے معاملہ میں اسلام کا تیسرا اعظیم کنٹری بیوشن یہ ہے کہ اس نے مساویانہ انصاف کا ایک کامل تاریخی نمونہ قائم کر دیا ہے۔ عام خاندانی اور سماجی زندگی سے لے کر حکومت اور اقتدار تک ہر مرحلہ میں اس اصول کو عملاً برت کر دکھا دیا گیا ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ ہر انسان یکساں عزت کا مستحق ہے۔ اور ہر انسان سے یکساں گرفت کی جائے گی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

اسلام کی تاریخ اس عملی نمونہ کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ اسلامی تاریخ کی کسی بھی کتاب میں ان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ یہاں چند واقعات کا مختصر ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ زینب بنت جحش (وفات ۲۰ ھ) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی کی لڑکی تھیں اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ قدیم زمانہ میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی کا نکاح کسی غلام کے ساتھ ناقابل تصور تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو توڑنے کے لیے یہ فیصلہ فرمایا کہ زینب کا نکاح ایک غلام کے ساتھ کیا جائے۔ چنانچہ ایک حبشی غلام زید بن حارثہ کے ساتھ آپ نے سیدہ زینب کا نکاح کر دیا۔ قدیم زمانہ میں یہ انتہائی انوکھا واقعہ تھا۔ کیوں کہ غلام کا نکاح آزاد سے کرنا قدیم زمانہ میں بالکل ناقابل تصور تھا۔

۲۔ کعبہ ایک مقدس عبادت خانہ تھا۔ اس کی چھت پر صرف شریف قبیلہ کے افراد ہی چڑھ سکتے تھے۔ نیچے طبقہ کے کسی فرد کا کعبہ کی چھت پر چڑھنا قدیم زمانہ کے لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔ مکہ فتح ہوا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو اس طرح توڑا کہ حبشی غلام بلال بن رباح کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھیں اور اس کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دیں۔

یہ عرب کی تاریخ میں (اور ساری قدیم دنیا کی تاریخ میں) انوکھا واقعہ تھا۔ اگر اسلام غالب نہ آچکا ہوتا تو اس "گستاخی" پر یقیناً لوگ بلال کو مار ڈالتے۔ تاہم ان کے سخت تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے انھیں کتنا سخت جھٹکا لگا تھا۔ مکہ کے عتاب بن اسید نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ میرا باپ مرگیا اور آج وہ اس منظر کو دیکھنے کے لیے موجود نہیں (الحمد للہ الذی قبض ابی حتی لا یری ھذا الیوم) الحارث بن ہشام نے کہا کہ کیا محمد کو اس کالے کوّے کے سوا کوئی اور موذن نہیں ملتا تھا (ما وجد محمدٌ غیرَ ھذا الغراب الاسود موذناً) (الجامع لاحکام القرآن ۱۶/۳۴۱)

۳۔ خلیفہ چہارم علی بن ابی طالب کی ایک زرہ گم ہوگئی۔ اس کے بعد وہ کوفہ کے ایک نصرانی کے یہاں برآمد ہوئی۔ یہ معاملہ وقت کے قاضی شُریح بن الحارث کی عدالت میں پیش ہوا۔ علی بن ابی طالب عام شہری کی طرح ان کی عدالت میں گئے۔ حضرت علیؓ نے اپنے بیٹے کو گواہی میں پیش کیا تو قاضی نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں معتبر نہیں۔

خلیفہ وقت عدالت سے اپنا مقدمہ ہار گئے۔ تاہم نصرانی اس بات سے بہت متاثر ہوا کہ اسلام

کی عدالت میں خلیفہ اور عام شہری کے درمیان اس قدر برابری کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس نے خود سے اقرار کرلیا کہ علی بن ابی طالب سچے ہیں اور یہ زرہ واقعتہً انھیں کی ہے۔ یہ میری نہیں (عظمت صحابہ ۲۲-۲۴)

۴۔ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ مصر کے حاکم عمرو بن العاص کے لڑکے محمد بن عمرو ایک قبطی پر غصہ ہو گئے اور اس کو کوڑے سے مارا۔ یہ قبطی مصر سے چل کر مدینہ آیا اور عمر فاروق سے فریاد کی۔ عمر فاروق نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ محمد بن عمرو نے اس کو ناحق مارا ہے۔ انھوں نے فوراً اپنا آدمی مصر بھیج کر حاکم مصر اور ان کے لڑکے کو بلایا۔ جب وہ آگئے تو قبطی سے کہا کہ ان کو مارو۔

قبطی نے حاکم مصر کی موجودگی میں ان کے لڑکے کو مارنا شروع کیا اور ان کو لہولہان کر دیا۔ جب وہ پوری طرح مار چکا تو عمر فاروق نے عمرو بن العاص اور محمد بن عمرو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالانکہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا (عظمت صحابہ ۴۰-۴۱)

۵۔ فلسطین عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں فتح ہوا۔ مفتوحہ قوم سے معاہدہ طے کرنے کے یہ مقرر ہوا کہ خلیفہ خود فلسطین آئیں۔ عمر فاروق مدینہ سے روانہ ہوئے۔ وہ اس طرح چلے کہ ان کے جسم پر معمولی کپڑا تھا اور ایک خادم اور ایک اونٹ۔ انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ اگر میں تنہا اونٹ پر بیٹھوں اور تم پیدل چلو تو میں تمہارے اوپر ظلم کروں گا۔ اگر تم اونٹ پر بیٹھو اور میں پیدل چلوں تو تم میرے اوپر ظلم کروگے۔ اور اگر ہم دونوں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ جائیں تو ہم اونٹ کے اوپر ظلم کریں گے۔ بہتر ہے کہ ہم تینوں باری مقرر کرلیں۔

چنانچہ تین باری مقرر ہوئی ایک بار عمر فاروق بیٹھتے اور خادم پیدل چلتا۔ پھر خادم بیٹھتا اور عمر فاروق پیدل چلتے۔ اس کے بعد اونٹ خالی رہتا اور دونوں پیدل چلتے۔ خلیفہ دوم اس طرح سفر کرتے ہوئے مدینہ سے فلسطین پہنچے۔ (تعمیر کی طرف ۵۶-۵۷)

اسلام نے اس طرح اپنے فکری انقلاب اور اپنے عملی نمونوں کے ذریعہ ایک ایسی تاریخ پیدا کی جس نے زمین کے تقریباً تمام آباد حصہ کو متاثر کیا۔ یہ انقلاب اتنا طاقتور تھا کہ اس کے اثرات ہزار سال بعد تک بھی ختم نہ ہو سکے۔

اسلامی انقلاب کی ہمہ گیری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ اور تابعین کا زمانہ اسلام میں زرّیں زمانہ ہے۔ اس زمانہ

میں اسلام کی اقدار پوری طرح سماج کے اوپر چھائی رہیں۔ بعد کی نسلوں میں جب اس انقلاب کے اثرات کم ہوئے اس وقت بھی ماحول میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آسکی۔ حتیٰ کہ مسلم بادشاہوں کو بھی اس سے سرتابی کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

اسلام کے ذریعہ توحید کا جو انقلاب آیا اس نے خدا کا رب ہونا اور انسان کا صرف عبد ہونا اتنے طاقت ور انداز میں لوگوں کے ذہنوں پر رائج کر دیا کہ کسی کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ دولت یا اقتدار پا کر اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ و ارفع سمجھنے لگے، جیسا کہ پچھلی تاریخ میں ہوا کرتا تھا۔

نصر بن احمد بن اسد بن سامان (م ۲۷۹ھ) دولت السامانیہ (Samanids) کا بانی ہے۔ یہ حکومت ایران یا ماوراء النہر (Transoxania) میں ۸۱۹ء سے ۹۹۹ء تک قائم رہی۔

سلطان نصر نے جب نیشاپور کو فتح کر کے اس کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تو وہاں اس نے ایک شاندار دربار منعقد کیا۔ تخت نشینی کی رسم کے افتتاح کے لیے ایک حافظ سے تلاوت کرائی گئی۔ وہ تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچے : یوم ھم بارزون لایخفی علی اللہ منھم شیء۔ لمن الملک الیوم۔ للہ الواحد القہار (المومن ۱۶) حافظ قرآن نے جب یہ آیت پڑھی تو اس کو سن کر سلطان نصر کے جسم پر کپکپی طاری ہو گئی۔ شدتِ احساس کے تحت وہ تخت سے نیچے آگیا اس نے تاج کو اپنے سر سے اتارا اور زمین پر سجدہ میں گر گیا۔ اس نے کہا : اے میرے رب، بلاشبہہ بادشاہی تیری ہے نہ کہ میری۔

قدیم زمانہ شاہی مطلق العنانی کا زمانہ تھا۔ اس زمانہ کے غالب فکر میں بادشاہ کی برتری اور بقیہ انسانوں کی کمتری ایک مسلّمہ کا درجہ اختیار کر گئی تھی۔ اس کا اثر عملی واقعات پر پڑتا تھا۔ اسلامی انقلاب نے شخصی بڑائی کے دور کو ختم کیا۔ اس نے انسانی برابری کے تصور کو ایک مسلّمہ کی حیثیت سے تاریخ میں رواج دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانی اعمال اِس فکر کے زیرِ اثر انجام پانے لگے۔

پوری اسلامی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں موضوع کی نسبت سے میں دورِ آخر کے ایک واقعہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں۔ یہ مغل بادشاہ جہانگیر کا واقعہ ہے۔ اس واقعہ کو مورخ اسلام مولانا شبلی نعمانی نے " عدل جہانگیری " کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ یہ پوری نظم اگلے صفحہ پر نقل کی جارہی ہے :

قصرِ شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گزر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

کوئی شامت زدہ رہ گیر اُدھر آنکلا
گرچہ تھی قصر میں ہر چار طرف سے قدغن

غیرتِ حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتۂ بے گور و کفن

ساتھ ہی شاہِ جہانگیر کو پہنچی جو خبر
غیظ سے آگئی ابروے عدالت پہ شکن

حکم بھیجا کہ کنیزانِ شبستانِ شہی
جا کے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

نخوتِ حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا
میری جانب سے کرو عرض بہ آئینِ حسن

ہاں مجھے واقعۂ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموسِ حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن

اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اُس کو ہلاک
کشورِ حسن میں جاری ہے یہی شرعِ کہن

مفتیِ دیں سے جہانگیر نے فتویٰ پوچھا
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

مفتیِ دین نے بے خوف و خطر صاف کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اُڑا دو گردن

لوگ دربار میں اِس حکم سے تھرّا اُٹھے
پر جہانگیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستۂ زنجیر و رسن

پھر اُسی طرح اُسے کھینچ کے باہر لائیں
اور جلاّد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی
تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہِ زمن

اِس کی پیشانیِ نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ
جا کے بن جاتی تھی اوراقِ حکومت پہ شکن

اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ اندازِ غرور
نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدۂ صبر شکن

اب وہی پاؤں ہر اک گام پہ تھرّاتے ہیں
جن کی رفتار سے پامال تھے مرغانِ چمن

ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع
ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

خدمتِ شاہ میں بیگم نے یہ بھیجا پیغام
خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امرِ حسن

مفتیِ شرع سے پھر شاہ نے فتویٰ پوچھا
بولے جائز ہے، رضامند ہوں گر بچہ و زن

وارثوں کو جو دیے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہِ زمن

ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
قتل کا حکم جو رُک جائے تو ہے مستحسن

ہو چکا جب کہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
کہ نہیں اس میں کوئی شائبۂ حیلۂ دفن

اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم
تھی جہاں نور جہاں معتکفِ بیتِ حزن

دفعتۂ پاؤں پہ بیگم کے گرا اور یہ کہا
تو اگر کشتہ شدی آہ چہ می کردم من

مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں یہ واقعہ ہوا کہ اس کی ملکہ نور جہاں نے ایک غریب آدمی کو بے گناہ قتل کر دیا۔ یہ معاملہ عدالت میں پیش ہوا۔ اسلامی قاضی نے فیصلہ کیا کہ مقتول کے بدلے قاتل (نور جہاں) کو قتل کر دیا جائے۔ بادشاہ یا ملکہ کسی کو ہمت نہیں ہوئی کہ قاضی کے فیصلہ کو ماننے سے انکار کرے۔ یہاں تک کہ خود اسلامی قانون ہی کی ایک اور دفعہ کے تحت معاملہ کو طے کیا گیا۔

اب اس کے مقابل کی مثال لیجئے۔ ہندستانی حکمراں جہانگیر (۱۶۲۷-۱۵۶۹) کا ہم عصر برطانیہ کا حکمراں جیمز فرسٹ (۱۶۲۵-۱۵۶۶) تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں قانون سے اوپر ہوں۔ میں ذاتی رائے سے جو چاہوں فیصلہ کر سکتا ہوں۔ اس زمانہ کے برطانی چیف جسٹس سر ایڈورڈ کوک (۱۶۳۴-۱۵۵۲) نے اس سے اختلاف کیا۔

جان بیٹ (John Bate) ایک برٹش مرچنٹ تھا۔ اس نے ایک بار امپورٹڈ کشمش پر ٹیکس دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ پارلیمنٹ نے ایسا قانون نہیں بنایا تھا۔ بلکہ جیمز فرسٹ نے ذاتی فرمان سے اس کو جاری کیا تھا۔ جسٹس کوک نے جان بیٹ کی حمایت کی۔ اس پر بادشاہ غصہ ہو گیا۔ اس نے کہا کہ کیا میں قانون کے ماتحت ہوں۔ یہ تو غداری ہے :

Am I subject to the law. To say so is treason.

جسٹس کوک اپنے نظریہ پر قائم رہے۔ اس کے نتیجہ میں بادشاہ نے ان کو جج کے عہدہ سے ہٹا دیا۔ ان کے بارہ میں تاریخ بتاتی ہے کہ بادشاہ سے ان کے قانونی اختلافات ہوئے اور آخر کار انھوں نے اپنا عہدہ کھو دیا :

That eventually broke his judicial career. (4/825)

جس وقت بادشاہ اور جسٹس کوک کا کیس برطانیہ کی پریوی کونسل میں آیا تو اس وقت کے اٹارنی جنرل فرانسس بیکن (Francis Bacon) نے بادشاہ کی قانونی بالاتری کی حمایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ججوں کو شیر ہونا چاہیے مگر انھیں ایسے شیر ہونا چاہیے جو شاہی تخت کے ماتحت ہوں :

Judges should be lions, but yet lions under the throne. (1/92)

پچھلے تمام زمانوں میں قانون کی دو قسمیں تھیں۔ اس کو برطانیہ کی قانونی روایات میں عوامی قانون (common law) اور شاہی قانون (Royal prerogative) کہا جاتا ہے۔ اس کے

مطابق عوام کے لیے ایک قانون تھا اور بادشاہوں اور اعلیٰ خاندان کے لوگوں کے لیے دوسرا قانون۔ بادشاہ کی زبان قانون ہوتی تھی۔ وہ ہر قانون سے بالاتر تھا۔ یہ اسلام ہے جس نے معلوم تاریخ میں پہلی بار قانون کی اس تقسیم کو توڑا اور تمام لوگوں کے لیے یکساں قانون جاری کیا۔ اب شاہی قانون (rule of king) ختم ہوگیا اور ہر آدمی بشمول بادشاہ قانون کی حکمرانی (rule of law) کے تحت آگیا۔

تاریخ پر اثرات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے آخری سال حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر آپ نے وہ خطبہ دیا جو خطبۂ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس خطبہ میں آپ نے جو تاریخی اعلانات فرمائے ان میں سے ایک اعلان یہ تھا :

الا کل شیئ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع۔ سن لو، جاہلیت کے معاملہ کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے پامال کر دی گئی۔

ان الفاظ میں آپ نے ایک نئے دور کا اعلان فرمایا جو اللہ کی مدد سے آپ کے ذریعہ تاریخ انسانی میں ظاہر ہوا۔ آپ کے ذریعہ تاریخ میں وہ اسباب پیدا کیے گئے جس کے بعد یہ ناممکن ہوگیا کہ کوئی جاہلی طریقہ انسانی زندگی میں اپنی جڑ قائم کر سکے۔

اسلام عرب سے نکل کر مختلف ملکوں میں پھیلا۔ دنیا کا بہت بڑا حصہ اہل اسلام کے زیر اقتدار آگیا۔ مگر کہیں بھی وہ نسلی تفریق ظہور میں نہ آسکی جو دوسری قوموں اور تہذیبوں کے عروج کے زمانہ میں پیدا ہوئی۔ اسی زمانہ میں افریقہ کے بیشتر باشندوں نے اسلام قبول کرلیا۔ یہ سب سیاہ فام تھے اور اسلام سے پہلے انھیں پیدائشی غلام سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسلام قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔ اسلام میں داخل ہوکر وہ یکساں طور پر اسلامی برادری کا حصہ بن گئے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار نے افریقہ اور دوسرے علاقوں میں اسلام کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے اس تاریخی حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے کہ مسلم ملکوں میں سے کسی ملک میں بھی نسل کی بنیاد پر ذات کا نظام کبھی قائم نہ ہوسکا :

None of the Muslim countries ever developed a racial caste system. (15/361)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا ظہور دنیا میں ایک سماجی انقلاب کا ظہور تھا۔ یہ تاریخی تبدیلی اوّلاً عرب اور اطرافِ عرب میں آئی۔ اس کے بعد اس کے اثرات تمام دنیا میں پھیل گئے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ انسانی سماج سے آزاد اور غلام کی تقسیم ہمیشہ کے لیے نابود ہوگئی۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے دنیا میں قانون کی حکمرانی کا دور شروع ہوا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ سماجی نابرابری یا سماجی ناانصافی کو جائز ٹھہرانے والے تمام فلسفے دنیا سے ختم ہو گئے۔

یہ تاریخی تبدیلی اس حد تک موثر ہوئی ہے کہ اب اگر کوئی سرپھرا شخص دوبارہ انسانیت کے بارہ میں اس قسم کا تفریقی نظریہ لے کر اٹھتا ہے تو وہ اپنے آپ مٹ کر رہ جاتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں اس کی ایک مثال ہٹلر (۱۹۴۵-۱۸۸۹) ہے۔ ہٹلر کے نزدیک جرمن نسل سب سے عظیم (greatest) نسل تھی۔ اس نے کہا کہ جرمن نسل کا یہ پیدائشی حق ہے کہ وہ تمام دوسری قوموں کے اوپر حکومت کرے۔ اس کا خیال تھا کہ نسلوں اور افراد کے درمیان نابرابری ایک ناقابل تغیر فطری نظام ہے۔ اس نے آرین نسل کو انسانیت کا واحد تخلیقی عنصر قرار دیا :

> He regarded inequality between races and individuals as part of unchangeable natural order and exalted the Aryan Race as the sole creative element of mankind. (8/967)

مگر ہٹلر کا انجام کیا ہوا۔ وہ وقتی طور پر یورپ میں ابھرا۔ مگر آخر کار وہ خود اپنے ملک میں تنہا رہ گیا اور مایوسی کے عالم میں برلن کے ایک بنکر میں خودکشی کر لی۔ اس کے بعد وہ بھی مٹ گیا اور اس کی اٹھائی ہوئی نازی تحریک بھی ختم ہوگئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جو سماجی انقلاب برپا کیا، اس کے اثرات براہِ راست طور پر مسلم قوموں میں سفر کر رہے ہیں اور بالواسطہ طور پر سارے عالم انسانی میں۔

فرق کا سبب

سوشل جسٹس یا مساوی انصاف (equal justice) کے بارہ میں محققین نے اعتراف کیا ہے کہ یہ مقصد اگر حقیقی طور پر کسی نظام میں حاصل ہوا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس سلسلہ میں ایک بیان سوامی ویویکانند کا ہے جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔ یہاں یہ سوال ہے کہ اس انسانی مقصد کو حاصل

کرنے میں صرف اسلام ہی کیوں کامیاب ہوسکا۔ دوسرے نظام یا مذہب اس مقصد کے حصول میں ناکام کیوں ہوگئے۔ اس کی دو خاص وجہیں ہیں۔ دونوں کو واضح کرنے کے لیے یہاں ہم ہندوازم اور مسیحیت کی مثال دیں گے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اسلام میں انسانی برابری کے حق میں ایک مکمل آئیڈیالوجی پائی جاتی ہے۔ جب کہ دوسرے کسی نظام میں ایسی آئیڈیالوجی موجود نہیں۔ مثال کے طور پر ہندوازم، جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، عین اپنے عقیدہ کی رو سے انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اس کی عین فلاسفی کا یہ تقاضا ہے کہ انسانوں میں ایک گروہ کو اونچا درجہ ملے، اور دوسرے کو نیچے درجہ کی مخلوق سمجھا جائے۔ اس عقیدہ کی موجودگی میں دونوں گروہوں سے برابر کا معاملہ کیا جانا ممکن نہیں۔ جو لوگ اس اعتقادی نظام سے متاثر ہوں وہ کبھی ان لوگوں کو اپنا مساوی نہیں سمجھ سکتے جن کو وہ بظاہر اپنے سے کمتر دیکھ رہے ہوں۔

یہاں میں یاد دلاؤں گا کہ ۱۹۵۳ میں پریسیڈنٹ آف انڈیا نے بیک ورڈ کلاسز کمیشن (Backward Classes Commission) مقرر کیا تھا۔ اس کے چیرمین کاکا صاحب کالیلکر تھے۔ اس کمیشن نے مفصل جائزہ کے بعد ۱۹۵۵ میں اپنی ۲۶۲ صفحہ کی رپورٹ پیش کی جو گورنمنٹ پریس سے ۱۹۵۶ میں شائع ہوئی۔ یہ مطبوعہ رپورٹ دہلی پبلک لائبریری میں موجود ہے اور میں نے وہیں سے لے کر اس کو پڑھا ہے۔

اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بھارت میں ذات پات کا جو نظام پایا جاتا ہے وہ بقیہ دنیا سے بالکل الگ نوعیت کا ہے۔ یہ صرف معاشی اسباب سے نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر دوسرے ملکوں میں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے اسباب زیادہ گہرے ہیں۔ اس کی جڑیں بھارت کے اقتصادی نظام میں پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ یہ صرف انڈیا کی خصوصیت ہے کہ اس نے سماجی نابرابری کو انسانی فطرت میں شامل قرار دیا۔ اس نے مذہبی اور روحانی پس منظر میں اس کو ایک پُراسرار ادارہ کی حیثیت دیدی :

> It is the peculiarity of India that it recognised the social differences inherent in human nature and gave them an institutional and mystic form with a religious and spiritual background. (p.14)

کالیلکر کمیشن نے جو بات کہی وہ عین مطابق واقعہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈیا میں اونچ نیچ کو ایک پیدائشی فرق کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ اس عقیدہ کے مطابق یہ ایک حتمی اور ناگزیر فطری حقیقت ہے۔ اور جہاں ایسا عقیدہ پایا جائے وہاں فرق کو مٹانے یا سب کو یکساں انصاف دینے کا ذہن ہی سرے سے پیدا نہیں ہو سکتا۔

اس سلسلہ میں دوسری رکاوٹ کی مثال مسیحیت کے نظام میں نظر آتی ہے۔ یہاں میں ایک رپورٹ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ریویو (۲۲ دسمبر ۱۹۹۱) میں چھپی ہے۔ یہ رپورٹ پانچ کرسچین جرنلسٹوں کی ایک ٹیم نے تیار کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق، انڈیا میں مسیحی فرقہ کی جو تعداد ہے اس میں ۵۰ فی صد سے زیادہ نچلے طبقہ کے لوگ ہیں جن کو دلت کرسچین (Dalit Christians) کہا جاتا ہے۔ وہ اب تک چرچ کی طرف سے امتیازی سلوک کا شکار ہو رہے ہیں :

Those who came over from the backward Hindu strata still find themselves bogged down in discrimination from the church.

دلت کرسچین کا مُردہ شخص "اپر کاسٹ کرسچین" کے قبرستان میں دفن نہیں ہو سکتا۔ اس کا نکاح اونچے طبقہ کے مسیحیوں میں نہیں ہو سکتا۔ چرچ میں ان کے لیے علٰحدہ نشست ہوتی ہے۔ تعلیمی اداروں میں ان کے ساتھ امتیاز برتا جاتا ہے۔ چرچ کے اعلیٰ عہدے ان کو نہیں دیے جاتے۔ کیرلا میں مسیحیت دو ہزار سال سے ہے مگر اب تک وہاں یہ تفریق پائی جاتی ہے۔ برابری کا درجہ (equal status) نہ ملنے کی وجہ سے دلت کرسچین میں سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔ چنانچہ اب تک چھ ہزار مسیحی اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب میں چلے گئے۔

مدراس کے کیتھولک آرک بشپ (Dr Casmur Guanadickman) سے اس سلسلہ میں سوال کیا گیا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ چرچ کے نظام میں طاقتور کاسٹ سسٹم (strong caste system) موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں مانتا ہوں کہ یہ الٹی طرف قدم ہے۔ مگر بعض اوقات عقیدہ کی طاقت حقیقت کو توڑنے میں کامیاب نہیں ہوتی :

I agree, it was a retrograde step. But sometimes the power of faith cannot break reality.

مسیحیت کا عقیدہ نابرابری یا سماجی بے انصافی کی تعلیم نہیں دیتا۔ مگر مسیحیت کی کمی یہ ہے کہ اس کے یہاں اس عقیدہ کی پشت پر مساوات کا کوئی طاقت ور تاریخی نمونہ موجود نہیں۔ حضرت مسیح کا مشن دعوت کے مرحلہ ہی میں ختم ہوگیا۔ وہ عملی انقلاب کے مرحلہ تک نہیں پہنچا۔ اس لیے مسیحیت کے دورِ اوّل میں مساوات کا طاقت ور عملی نمونہ بھی قائم نہ ہو سکا۔ ایسی حالت میں صرف عقیدہ عملی تبدیلی لانے کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کا معاملہ مذکورہ دونوں نظاموں کے برعکس یہ ہے کہ اس کے یہاں مساوات اور برابری کے سلوک کے حق میں ایک مکمل آئیڈیالوجی موجود ہے۔ اسی کے ساتھ اسلام میں ایک انتہائی کامل اور معیاری عملی نمونہ موجود ہے۔ اسلام کے دورِ اول کی تاریخ میں ان دونوں چیزوں کی موجودگی نے ہمیشہ کے لیے اسلام کی تاریخ کا رخ متعین کر دیا ہے۔ اب اسلامی تاریخ کو اسی رخ پر سفر کرنا ہے۔ کوئی اور رخ اتنا طاقت ور نہیں ہو سکتا کہ وہ اسلام کی تاریخ کے سفر کو اس کی طرف موڑ دے۔

اسلام کی یہ خصوصیت تمام انسانوں کے لیے رحمت ہے۔ وہ ساری قوموں کے لیے امید کی روشنی ہے۔ اس معاملہ میں اگر تعصب کو دخل نہ دیا جائے اور اسی طرح کھلے ذہن کا ثبوت دیا جائے جو مذہب کے علاوہ تمام سیکولر باتوں کے لیے ہمیشہ اختیار کیا جاتا ہے تو اچانک لوگوں کو معلوم ہو کہ اسلام کی صورت میں یہاں خداوند عالم کی ایک عظیم رحمت خدا کے تمام بندوں کے لیے موجود ہے۔

اسلام کسی گروہ کی قومی روایت نہیں۔ حتیٰ کہ وہ دوسرے مذاہب سے الگ کوئی انوکھا مذہب بھی نہیں۔ وہ پچھلے مذاہب ہی کا محفوظ اور مستند اڈیشن ہے۔ وہ ہر ایک کی فطرت کی آواز ہے۔ اس نظر سے دیکھا جائے تو اسلام ہر آدمی کو خود اپنا اثاثہ معلوم ہوگا۔ اسلام کو پانا اس کے لیے ایسا ہی ہوگا جیسے کوئی شخص خود اپنی ایک کھوئی چیز کو ازسرِنو پا جائے۔

طلاق اسلام میں

یہ فطرت کا تقاضا ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو کر ایک ساتھ زندگی گزاریں۔ اسلامی شریعت میں اس کے لیے نکاح کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کے مطابق، نکاح ایک معاشرتی عہد (civil contract) ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کی باہمی رضامندی (mutual consent) سے وقوع میں آتا ہے۔

نکاح کا یہ عمل ایک اعتبار سے خاندانی زندگی کی تعمیر ہے۔ اور دوسرے اعتبار سے وہ پورے انسانی سماج کی تربیت ہے۔ عورت اور مرد اگر اپنی شادی شدہ زندگی میں اچھی بیوی اور اچھے شوہر ثابت ہوں تو یقینی طور پر وہ وسیع تر سماج کے لیے بھی اچھے شہری ثابت ہوں گے۔ اسی لیے حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہے (خیرکم خیرکم لاھلہ) سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح

شادی شدہ زندگی کی یہی خاص اہمیت ہے جس کی بنا پر اسلام میں اس رشتہ کو نہایت مقدس قرار دیا گیا ہے، اور اس کی پائداری اور خوش گواری کے لیے تفصیلی احکام مقرر کیے گئے ہیں۔ تاہم زیادہ قانونی بندش بغاوت کا ذہن پیدا کرتی ہے۔ اس لیے اسلام میں فطری حد تک ضروری قانونی بندش مقرر کرنے کے بعد یہ کوشش کی گئی ہے کہ انسانی ارادہ کی اس طرح تربیت کی جائے کہ وہ خود اپنے فیصلہ سے اپنے آپ کو صحیح مطلوبہ حد کے اندر قائم رکھے۔

خاندان دراصل تربیتِ انسانی کا ابتدائی یونٹ ہے۔ خاندان کے ادارہ کا ٹوٹنا تربیتِ انسانی کے ادارہ کا ٹوٹنا ہے۔ اگر خاندان کا ادارہ بار بار ٹوٹنے لگے تو اس کا یہ عظیم نقصان ہوگا کہ تربیتِ افراد کا وہ کام ہونے سے رہ جائے گا جس کے اوپر انسانیت کی تعمیر کا انحصار ہے۔

اسلامی شریعت میں اس سلسلہ میں طلاق کے لیے جو قوانین بنائے گئے ہیں وہ بنیادی طور پر طلاق کو روکنے کے لیے ہیں نہ کہ طلاق کو وقوع میں لانے کے لیے۔ شریعت کی ساری کوشش یہ ہے کہ طلاق کے عمل کو روکا جائے۔ عورت اور مرد جب ایک بار رشتۂ

نکاح میں منسلک ہو کر ایک خاندان بنائیں تو وہ آخر وقت تک اس کو قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ اسی لیے رشتۂ نکاح کو قرآن میں میثاق غلیظ (النساء ۲۱) کہا گیا ہے، یعنی پختہ عہد۔

نکاح زندگی کا ایک عمومی قانون ہے اور طلاق صرف ایک استثناء ہے۔ اسی لیے اسلام میں نکاح کو انتہائی پسندیدہ چیز قرار دیا گیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

النکاحُ مِن سنتی فمَن لم یعمل بسنتی فلیس منی (سنن ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ما جاء فی فضل النکاح)

نکاح میرا طریقہ ہے۔ پس جو شخص میرے طریقہ پر عمل نہ کرے وہ مجھ سے نہیں۔

طلاق کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے، اسلام میں اگرچہ طلاق کی اجازت ہے۔ مگر اسی کے ساتھ تاکید کی گئی ہے کہ اس کو صرف انتہائی ناگزیر حالت میں استعمال کیا جائے۔ چنانچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طلاق اگرچہ حلال ہے مگر وہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض حلال ہے (ابغضُ الحلالِ الی اللہِ تعالیٰ الطلاقُ) سنن ابی داؤد، ابواب الطلاق، باب فی کراہیۃ الطلاق

۱۔ جب ایک مرد اور ایک عورت شوہر اور بیوی کی حیثیت سے مل کر ساتھ رہتے ہیں تو، فطرت کے عام قانون کے تحت، دونوں کے درمیان اختلافات بھی ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک حیاتیاتی اور نفسیاتی حقیقت ہے کہ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر مرد اور پیدا ہونے والی ہر عورت ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے اس دنیا میں اتحاد کی ایک ہی ممکن صورت ہے ——— اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا۔

شکایت کو نظرانداز کرتے ہوئے مل کر رہنے کا یہ مقصد کس طرح حاصل ہوگا، اس کا راز، ایک لفظ میں صبر ہے۔ صبر کا مزاج ہی واحد چیز ہے جو دو شخصوں کے درمیان مشترک اور متحد زندگی کو ممکن بناتا ہے۔ جب انسانی فطرت کے تحت شکایت کے اسباب کا پیش آنا لازمی ہو، اور اسی کے ساتھ عورت اور مرد کی مشترک زندگی بھی ایک لازمی انسانی ضرورت ہو تو عملی طور پر اشتراک اور اتحاد کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ دونوں صبر و

اعراض کو زندگی کے ایک مستقل اصول کے طور پر اختیار کر لیں۔

کسی بھی سماج میں طلاق کے جو واقعات ہوتے ہیں، ان کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۹۰ فی صد طلاق کے واقعات کا سبب "زبان درازی" ہے۔ کسی بات پر عورت یا مرد کو غصہ آگیا یا کوئی بات اس کو ناگوار معلوم ہوئی۔ اس کے بعد اس کی زبان سے سخت الفاظ نکل گئے۔ دوسرا فریق اس کو نظر انداز نہ کر سکا، اس نے بھی جواب میں سخت جملہ کہہ دیا۔ اب تلخ تکرار کی نوبت آگئی۔ اس تلخی کے زیر اثر مرد نے کہہ دیا کہ تم کو طلاق۔ یا عورت نے کہہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ طلاق یا علاحدگی کا سبب زیادہ تر اسی قسم کے واقعات ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مومن مرد اور مومن عورت کی صفات بتاتے ہوئے ایک صفت والصابرین والصابرات (الاحزاب ۳۵) کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔ قرآن کی اس آیت کے مطابق، مرد کو بھی صبر کی روش اختیار کرنا ہے اور عورت کو بھی صبر کے طریقہ پر قائم رہنا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کرنا ہے۔ اگر وہ صبر و برداشت کی روش اختیار نہ کریں تو ان کا باہمی رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور باہمی رشتہ ٹوٹنے کے بعد دونوں کو اس سے زیادہ بڑی بات برداشت کرنی پڑے گی جو رشتہ کو باقی رکھنے کی صورت میں انھیں برداشت کرنے کی ضرورت تھی۔

زوجین کو صبر و برداشت کی عام تلقین کے علاوہ اس سلسلہ میں بعض خصوصی ہدایتیں بھی احادیث میں دی گئی ہیں جو نکاح کے بندھن میں پائداری کے لیے ضروری ہیں۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لا یَفرَكْ مؤمنٌ مؤمنةً إن كرِهَ منها خلقاً رضِيَ منها آخَرَ۔
(صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء)

کوئی مومن مرد کسی مومن عورت سے بغض نہ کرے۔ اگر اس کی کوئی عادت اس کو بری لگے تو اس میں دوسری عادت ہوگی جو اس کو خوش کر دے۔

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ ہر آدمی کے اندر کچھ اچھی باتیں ہوتی ہیں اور اسی کے ساتھ کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو اس کی کمزوری کہا جا سکتا ہے۔ یہی معاملہ شوہر اور بیوی کا بھی ہے۔ ایسی

حالت میں دونوں کے درمیان نباہ کا فطری اصول یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی شخصیت کے اچھے پہلو کو یاد رکھیں، اور دونوں ایک دوسرے کے کمزور پہلو کو نظر انداز کرتے رہیں۔ اگر عورت اور مرد اس معاملہ میں باشعور ہو جائیں اور اس کو ایک اصول کے طور پر اپنی زندگی میں اختیار کر لیں تو یقیناً وہ ان کے لیے پائدار ازدواجی زندگی کی ضمانت بن جائے گا۔

۲۔ تاہم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مذکورہ تدبیر کافی نہیں ہوتی۔ شوہر اور بیوی کے درمیان ایسی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو بظاہر اس سے زیادہ سخت ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس قسم کی صورت پیش آنے کے بعد بھی یہ صحیح نہیں ہے کہ جہاں ایسا ہو فوراً طلاق دے کر علاحدگی اختیار کر لی جائے۔ اس کے بجائے تحمل سے کام لیتے ہوئے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہم کو حسب ذیل آیت میں رہنمائی دی گئی ہے:

والتی تخافون نشوزھن فعظوھن واھجروھن فی المضاجع واضربوھن فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن سبیلا (النساء ۳۴)

اور جن عورتوں سے تم کو نافرمانی کا اندیشہ ہو ان کو سمجھاؤ اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو اور ان کو مارو۔ پس اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف الزام کی راہ تلاش نہ کرو۔

کسی مرد کو اگر اپنی بیوی سے شکایت پیدا ہو تو اس کے لیے پہلا کام طلاق دینا نہیں ہے، بلکہ عورت کو نصیحت کرنا ہے۔ یعنی نرمی، سنجیدگی اور خیر خواہی کے ساتھ اس کو سمجھایا جائے۔ نفرت کے جواب میں نفرت نہ کی جائے بلکہ نفرت کے جواب میں محبت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

اگر نصیحت بے اثر رہ جائے تو اس کے بعد شوہر کو اپنی بیوی کے ساتھ ترک کلام یا ترک صحبت کا تجربہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس میں بھی انتقام کا جذبہ ہرگز شامل نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو مکمل طور پر اصلاح اور تربیت کے ذہن کے تحت انجام دینا چاہیے۔

اگر بالفرض کوئی عورت ایسی ہے جس کے لیے نصیحت اور ترک تعلق کی تدبیریں غیر موثر ثابت ہوتی ہیں تو اس کے بعد اجازت ہے کہ مرد اس کو ہلکی سزا دے سکتا ہے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ضرب (مارنے) کی اجازت صرف اختلاف یا شکایت پر ہرگز نہیں ہے۔ یہ نشوز پر ہے۔ نشوز کی تشریح حدیث میں معروف میں نافرمانی سے کی گئی ہے (اضربوھن اذا عصینکم فی المعروف) نیز یہ کہ اس ضرب کو بے تکلیف کی مار (ضرباً غیر مبرح) ہونا چاہیے۔ بے تکلیف کی مار کیا ہے، اس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ مسواک (ٹوتھ برش) یا اس جیسی کسی چیز سے مارنا (بالسواک ونحوہ) جامع البیان للطبری ۵/۶۷—۶۹

۲۔ زوجین میں اختلاف ظاہر ہو تو کوشش یہ ہونا چاہیے کہ دونوں آپس ہی میں صلح کرلیں۔ کیونکہ صلح کا طریقہ اللہ کے نزدیک ہر حال میں بہتر ہے (والصلح خیر، النساء ۱۲۸) اور اگر گھریلو سطح پر معاملہ ختم نہ ہو تب بھی طلاق کی بات نہیں کرنا ہے بلکہ ثالثی کے طریقہ پر اس کو حل کرنے کی کوشش کرنا ہے:

وإن خفتم شقاق بينهما فابعثوا حكمًا من أهله وحكمًا من أهلها إن يريدا إصلاحًا يوفق الله بينهما۔ إن الله كان عليمًا خبيرًا۔ (النساء ۳۵)

اور اگر تم کو دونوں کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک ثالث مرد کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک ثالث عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کردے گا۔ بے شک اللہ جاننے والا، باخبر ہے۔

دو شخصوں کی نزاع کو ثالث (arbiter) کے ذریعہ طے کرنے کا یہ اصول نہایت فطری اصول ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان جب اختلاف پیدا ہو جائے تو دونوں ایک دوسرے کے بارہ میں متاثر ذہن کے تحت سوچنے لگتے ہیں۔ وہ حقائق کی بنیاد پر بے لاگ رائے نہیں قائم کرپاتے۔ ایسی حالت میں جھگڑے کو ختم کرنے کی بہترین تدبیر یہ ہے کہ ان دونوں کے علاوہ ایک تیسرے فریق کو درمیان میں لایا جائے۔ یہ تیسرا فریق معاملہ سے ذاتی طور پر وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے گا اور ایسے منصفانہ فیصلہ تک پہنچ جائے گا جو دونوں کے لیے

قابل قبول ہو۔

جب معاملہ کو ثالث کے سپرد کر دیا جائے تو اس وقت عورت اور مرد کو کس ذہن کے تحت اس کا استقبال کرنا چاہیے، اس کا اندازہ خلافتِ راشدہ کے زمانہ کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

خلیفۂ چہارم علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک عورت اور مرد کے درمیان ازدواجی جھگڑا ہوا۔ دونوں حضرت علی کے پاس آئے۔ آپ نے مذکورہ قرآنی آیت کے مطابق یہ حکم دیا کہ دونوں کے خاندان سے ایک ایک شخص کو لے کر ثالثی بورڈ بنایا جائے۔ یہ ثالثی بورڈ دونوں کے حالات معلوم کرنے کے بعد جو فیصلہ دے اس کو دونوں بلا بحث مان لیں۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں :

فقالتِ المرأةُ رضيتُ بكتابِ اللهِ لي وعليَّ۔ فقال الرجلُ اما الفرقةُ فلا۔ فقال عليٌّ كذبتَ، واللهِ لا تبرحُ حتّٰى ترضىٰ بمثلِ ما رضيتْ به (جامع البیان للطبری، ۵/۷۱)

عورت نے کہا کہ میں راضی ہوں اللہ کی کتاب پر، خواہ فیصلہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مرد نے کہا کہ مگر تفریق کا فیصلہ مجھے منظور نہیں۔ حضرت علی نے فرمایا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ خدا کی قسم تم یہاں سے اٹھ نہیں سکتے جب تک تم اس طرح راضی نہ ہو جاؤ جس طرح عورت راضی ہوئی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سچے مومن کے اندر یہ آمادگی ہونا چاہیے کہ وہ قرآنی حکم کے مطابق ثالث کو مانے اور یہ بھی آمادگی ہونا چاہیے کہ ثالث جو فیصلہ دے اس کو وہ مزید بحث کے بغیر قبول کر لے۔

۴۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زندگی کا نظام ہمیشہ مقرر انداز پر نہیں چلتا۔ چنانچہ سارے تحفظات کے باوجود ایسا ہوتا ہے کہ کچھ شادی شدہ جوڑے شادی کے بعد علٰحدگی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اندر نکاح کے بعد طلاق کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں شریعت ان کی رہ نمائی اس طرح کرتی ہے کہ ان کے لیے طلاق کا ایک متعین ضابطہ مقرر کرتی

ہے۔ یہ ضابطہ قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

الطلاق مرتان فامساك بمعروف او تسريح باحسان (البقرہ ۲۲۹)

طلاق دو بار ہے۔ پھر یا تو قاعدہ کے مطابق رکھ لینا ہے یا خوش اسلوبی کیساتھ رخصت کر دینا۔

اس آیت کی تشریح اس طرح کی گئی ہے کہ جو شخص (دو مہینہ میں) دو بار طلاق دیدے تو وہ تیسری بار طلاق دینے میں اللہ سے ڈرے۔ یا تو وہ اس کے حق میں کوئی بھی ظلم کیے بغیر اس کو چھوڑ دے، یا اس کو حسن معاشرت کے ساتھ روک لے (ای من طلّق اثنتين فليتق الله في الثالثة فاما تركها غير مظلومة شيئا من حقها واما امسكها محسنا عشرتها) الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۳/۱۲۶

اس آیت اور دوسری آیات و احادیث کی روشنی میں علما شریعت نے طلاق کا تفصیلی قانون مرتب کیا ہے، اس سلسلہ میں فقہی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے بنیادی شرعی پوزیشن یہ ہے کہ اپنے مراحل کے اعتبار سے طلاق کی تین صورتیں ہیں ——— طلاق رجعی، طلاق بائن، طلاق مغلظہ۔

جب ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے تو شریعت کی تعلیم یہ ہے کہ وہ ایسا نہ کرے کہ اچانک اس کو مطلقہ قرار دے کر اسے اپنے سے جدا کر دے۔ بلکہ اس کو یہ کرنا چاہیے کہ پہلے مہینہ میں حیض سے پاک ہونے کے بعد وہ اپنی عورت سے کہے کہ میں نے تم کو ایک طلاق دیا۔ اس کے بعد دونوں ایک مہینہ تک سوچتے رہیں۔ اس درمیان میں اگر رائے بدل گئی تو مرد اپنے قول طلاق کو واپس لے کر دوبارہ اپنی بیوی سے تعلقات قائم کر سکتا ہے۔

ایسا نہ کرنے کی صورت میں اگلے مہینہ میں دوبارہ طہر کی حالت میں وہ اپنی بیوی سے کہے گا کہ میں نے تم کو دوسری بار طلاق دیا۔ اس اثنا میں دوبارہ مرد کے لیے یہ موقع ہے کہ اگر اس کی رائے بدل جائے تو وہ طلاق کو واپس لے کر اپنی بیوی سے دوبارہ تعلقات قائم کر سکتا ہے۔ اصطلاح میں ان دونوں کو طلاق رجعی کہا جاتا ہے، کیوں کہ مرد کو ان سے مراجعت کا حق حاصل ہے۔

ابتدائی دو مہینوں میں مرد اگر اپنے قول سے رجوع نہ کرے اور تیسرا حیض آکر تیسرا مہینہ شروع ہو جائے تو اب عملی طور پر طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس کو طلاق بائن کہا جاتا ہے۔

طلاق بائن پڑ جانے کے بعد مراجعت کے لیے تنہا مرد کا قول کافی نہیں۔ اب صرف عورت اور مرد کی باہمی رضامندی سے نکاح ثانی ہو سکتا ہے۔ اگر دونوں نے نکاح ثانی کر لیا تو دوبارہ وہ شوہر اور بیوی کی طرح ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ آدمی تیسرے مہینہ میں یا اس کے بعد یہ کہہ دے کہ میں نے تم کو تیسری بار طلاق دیا۔ ایسا کہنے کے بعد آخری طلاق واقع ہو جائے گی۔ اس کو طلاق مغلظہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے کے لیے حرام ہو جائیں گے۔ البتہ اگر حلالہ کی صورت پیدا ہو جائے تو دوبارہ ان کے درمیان نکاح ہو سکتا ہے۔

شوہر اگر دوسری بار طلاق دینے کے بعد اپنی بیوی سے مراجعت کا ارادہ نہ رکھتا ہو تب بھی اسے چاہیے کہ عورت کو اس کے حقوق دے کر خوش اسلوبی کے ساتھ اسے رخصت کر دے۔ جہاں تک تیسری بار طلاق کا تعلق ہے تو شریعت نے اس کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ کیونکہ دو بار طلاق دے کر علٰحدہ ہو جانے کے بعد بھی یہ امکان باقی رہتا ہے کہ شوہر تجدید نکاح کے ذریعہ پھر اپنی سابقہ بیوی سے تعلق قائم کر لے۔ مگر تیسری بار طلاق دینے کے بعد مذکورہ استثنائی صورت (حلالہ) کے علاوہ اس مرد اور اس عورت کے درمیان نکاح مستقل طور پر حرام ہو جاتا ہے۔

مذکورہ مقرر طریقہ نے طلاق کو ایک جذباتی اقدام کے بجائے ایک سوچا سمجھا منصوبہ بند عمل بنا دیا۔ اگر اس حقیقت کو سامنے رکھا جائے کہ طلاق اکثر حالات میں غصہ کا نتیجہ ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ طریقہ طلاق کے خلاف ایک زبردست روک (check) ہے۔ کیونکہ غصہ کوئی مستقل باقی رہنے والی چیز نہیں۔ ایک مدت گزرنے کے بعد لازماً وہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ تقریباً یقینی ہے کہ جو لوگ غصہ کی بنا پر اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کریں گے، وقت گزرنے کے بعد وہ خود ہی اپنے کیے پر پچھتائیں گے۔ اور رجوع کر لیں گے۔ کیوں کہ طلاق کوئی سادہ بات نہیں۔ اکثر حالات میں وہ گھر کو اجاڑنے اور بچوں کے مستقبل کو تباہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی آدمی کو طلاق کا برا انجام دکھائی دے گا اور وہ رجوع کر کے اس سے باز رہے گا۔

آدمی جب ایک عورت سے نکاح کرتا ہے تو اس کے لیے صرف ایک بار یہ کہنا کافی ہوتا ہے کہ میں نے تم کو اپنی زوجیت میں قبول کیا۔ مگر طلاق کے لیے شریعت میں یہ حکم دیا گیا کہ تین مہینہ کے دوران مرحلہ وار طریقہ پر بتدریج اس کو مکمل کرو۔

گویا نکاح کے لیے تو ایک قول کافی ہے مگر طلاق کے عمل کی تکمیل کے لیے کئی قول کی ضرورت ہے۔ مزید یہ کہ نکاح کے برعکس، طلاق کے ایک قول اور دوسرے قول کے درمیان شریعت نے لمبا وقفہ (gap) دینا پسند کیا ہے۔ اس وقفہ کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا کہ اس دوران شوہر اپنے فیصلہ پر اچھی طرح غور کر لے۔ وہ اپنے قریبی لوگوں سے اس کے بارہ میں بخوبی مشورہ کرے۔ حتی کہ اس کے متعلقین کو یہ موقع بھی مل جائے کہ جب انھیں طلاق کے معاملہ کی خبر ملے تو اس میں دخل دے کر وہ طرفین کو سمجھائیں اور طلاق کو روکنے کی کوشش کریں۔ یہ مقصد وقفہ کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے طلاق کو ایک باوقفہ عمل بنا دیا گیا۔

ان ساری پیش بندیوں کا واضح مطلب یہ ہے کہ جذباتی ابال کو ٹھنڈا کیا جائے اور اس طرح طلاق کے معاملہ کو اس کے آخری انجام تک پہنچنے سے روکا جائے۔ کیوں کہ طلاق کسی بھی شخص کے لیے مسئلہ سے نجات کے ہم معنی نہیں ہے۔ طلاق اپنے انجام کے اعتبار سے صرف یہ ہے کہ آدمی ایک مسئلہ سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے آپ کو دوسرے شدید تر مسئلہ میں مبتلا کر لے۔

۵۔ ان ساری پیش بندیوں کے باوجود کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان بعض اوقات جہالت یا شدید غصہ کی وجہ سے معتدل انداز میں سوچ نہیں پاتا۔ وہ جوش میں آکر ایک ہی مجلس میں اپنی بیوی سے کہہ دیتا ہے کہ تم کو تین طلاق یا طلاق، طلاق، طلاق۔ ایسے واقعات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئے۔ اور اب بھی پیش آتے ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص ایسا کرے اس کے بارہ میں کیا فیصلہ کیا جائے۔ یعنی تین طلاق کو ایک طلاق قرار دے کر مذکورہ باوقفہ عمل جاری کرنے کی تلقین کی جائے۔ یا تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر میاں بیوی کے درمیان علٰحدگی کرا دی جائے۔ اس سلسلہ کی ایک رہنما حدیث یہاں درج کی جاتی ہے جس کو امام ابوداؤد اور دوسرے کئی محدثین نے نقل کیا ہے:

عن عبد الله بن عباس قال، طلق ركانة بن عبد يزيد امرأته ثلاثا فی مجلس واحد۔ فحزن علیها حزنا شدیدا۔ فسألہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ کیف طلقتها۔ قال ثلاثا فی مجلس واحد۔ فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ إنما تلك واحدة فارتجعها إن شئت (فتح الباری ۹/ ۲۷۵)

رکانہ ابن عبد یزید نے اپنی بیوی کو ایک مجلس میں تین طلاق دے دی۔ پھر وہ اس پر بہت غم گین ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ تم نے کس طرح طلاق دی۔ انھوں نے کہا کہ ایک مجلس میں تین بار۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ سب ایک ہی ہے۔ اگر تم چاہو تو اپنی بیوی سے مراجعت کرلو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص جذبات سے مغلوب ہوکر ایک ہی مجلس میں تینوں طلاق دینے کا اعلان کر دیتا ہے تو اگرچہ یہ شریعت کے مقرر طریقہ سے انحراف ہے اور اس اعتبار سے وہ آدمی گنہ گار ہے، تاہم انسانی کمزوری کی رعایت کرتے ہوئے اس کے اس فعل کو ایک لغو فعل قرار دیا جائے گا۔ اس کو تاکید بیان یا شدتِ اظہار پر محمول کرتے ہوئے تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیا جائے گا۔ ایسے آدمی سے کہا جائے گا کہ ایک شرعی مسئلہ میں تم نے جو زیادتی کی ہے اس کے لیے اللہ سے توبہ کرو اور تین کو ایک شمار کرتے ہوئے حسب منشا اپنی بیوی کے ساتھ معاملہ کرو۔

۶۔ تاہم اس مسئلہ میں دور اول میں ایک مختلف مثال ملتی ہے۔ یہ مثال خلیفہ ثانی عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ہے۔ یہ مثال امام مسلم کی ایک روایت میں اس طرح بیان ہوئی ہے:

عن ابن عباس، قالَ كانَ الطلاقُ علىٰ عهدِ رسول الله صلے الله علیہ وسلم وابی بكرٍ وسنتَینِ من خلافةِ عمرَ طلاقُ الثلاثِ واحدةً۔ فقال عُمر بن الخطاب انّ الناسَ قد استعجلوا فی امرٍ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں اور عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں تین طلاق ایک ہی طلاق ہوتی تھی۔ پھر عمر بن خطابؓ نے کہا کہ لوگ اُس معاملہ میں جلدبازی کر رہے ہیں جس میں ان کے لیے مہلت تھی۔

قد کانت لهم فیه اناةٌ فلو — پس کیوں نہ اس کو ہم ان کے اوپر نافذ کردیں۔
امضیناهُ علیهم فامضاهُ علیهم — چنانچہ انھوں نے ان کے اوپر اسے نافذ کردیا۔
(صحیح مسلم بشرح النووی ۱۰/۷۰)

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق کا یہ عمل بظاہر قرآن وسنت کے طریقہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے مگر یہ صرف ایک غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ شریعت کے عموم میں ایک وقتی استثنار کی مثال ہے نہ کہ شریعت کے عموم میں ترمیم کی مثال۔ خلیفۂ دوم کے اس عمل سے شریعت کا مذکورہ مسئلہ نہیں بدلتا۔ اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی میں حالات کی مکمل رعایت رکھی گئی ہے۔ شریعت کا ہر قانون ایک دائمی قانون ہے۔ مگر مسلمانوں کے حاکم کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی فرد کے کیس کی مخصوص نوعیت کی بنا پر اس کے حق میں ایک استثنائی فیصلہ کرے۔ تاہم حاکم کا یہ فیصلہ صرف ایک وقتی حکم ہوگا نہ کہ ابدی قانون۔

اس سلسلہ کی مختلف روایات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ دوم نے اپنے زمانہ کے جن چند افراد کیساتھ ایسا کیا وہ بطور شرعی مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کی حیثیت ایک قسم کے انتظامی حکم (executive order) کی تھی۔ انھوں نے حاکم کی حیثیت سے بعض متعین افراد کے لیے بطور سزا یہ حکم جاری کیا تھا۔

چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت عمر فاروق ؓ کے پاس ایسا کوئی آدمی لایا جاتا جس نے اپنی عورت کو ایک مجلس میں بیک وقت تین طلاق دی تھی تو اس کو وہ اس کی سرکشی قرار دیتے اور اس کی پیٹھ پر کوڑا مارتے (عن انس، ان عمر کان اذا اُتی برجل طلق امرأته ثلاثا اوجع ظهره) فتح الباری ۹/۲۰۵

۔ یہاں ایک اور پہلو کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ اس اضافہ کے بغیر یہ بات بالکل ادھوری رہے گی۔ وہ یہ کہ حضرت عمر نے جب تین طلاق کو تین طلاق قرار دینے کا مذکورہ استثنائی فیصلہ دیا تو ان کی حیثیت موجودہ زمانہ کے ایک بے اختیار عالم جیسی نہ تھی۔ بلکہ وہ مکمل طور پر ایک بااختیار حاکم کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ مسلّمہ طور پر اس پوزیشن میں تھے کہ جو مرد اس قسم کا غیر قرآنی طریقہ اختیار کرے اس کو وہ سزا دیں، اس کو اور کوئی زیادتی کرنے سے روک سکیں۔

دوسری طرف وہ اِس بااختیار حیثیت میں تھے کہ اِس حکم کے نفاذ کے نتیجہ میں جو عورت نئے مسائل حیات سے دوچار ہوئی ہے، اس کی بھی کامل تلافی کرسکیں۔ مثلاً سماج کے اندر اس کے لیے باعزت زندگی کی ضمانت، طلاق کے بعد اگر وہ معاشی اعتبار سے ضرورت مند ہوگئی ہے تو سرکاری بیت المال سے اس کے لیے مستقل گزارہ جاری کرنا، وغیرہ۔

آج اگر کوئی شخص تین طلاق کو نافذ کرنے کے لیے حضرت عمر فاروق کی نظیر پیش کرے تو اس سے پہلے اس کو خلیفہ جیسی بااختیار حیثیت کا مالک بننا چاہیے، اس کے بعد ہی اس کو یہ حق ہوگا کہ وہ خلیفۂ دوم کے اس مسلک کا حوالہ دے یا اس پر عمل کرے۔ کیوں کہ حضرت عمر کا مذکورہ فیصلہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے حاکم وقت کا ایک فیصلہ تھا نہ کہ سادہ طور پر صرف عالم یا مفتی کا ایک فیصلہ۔

۸۔ یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ خلیفہ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جب اپنا مذکورہ فیصلہ دیا تو بعض روایت کے مطابق صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے اختلاف کیا۔ بقیہ صحابہ جو اس وقت مدینہ میں موجود تھے یا جن کے علم میں یہ بات آئی، انھوں نے اس سے اختلاف کا اظہار نہیں کیا۔ اس سے کچھ علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اس مسئلہ پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے۔ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

واستدلوا باجماع الصحابة حين قضى به عمر بن الخطاب رضي الله عنه فاقروه عليه ولم ينكر احد من الصحابة وقوع الثلاث بلفظ واحد على عمر بن الخطاب فدل ذلك على الاجماع (روائع البیان ۱/۳۲۴)	اس سے علماء نے استدلال کیا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ کیوں کہ جب حضرت عمر نے یہ فیصلہ دیا تو صحابہ نے اس سے اتفاق کیا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کا انکار نہیں کیا کہ ایک بار میں تین طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس پر اجماع ہے۔

یہاں یہ سوال ہے کہ صحابہ نے کس چیز پر اتفاق کیا تھا۔ صحابہ نے اس پر اتفاق نہیں کیا تھا کہ تین طلاق کو تین طلاق قرار دینا اصولاً درست ہے۔ بلکہ ان کا اتفاق اس پر تھا کہ ایسا کرنا انتظاماً درست ہے۔

صحابہ کسی ایسی بات پر اتفاق نہیں کر سکتے تھے جو قرآن کے مقرر طریقہ کو بدلنے کے ہم معنی ہو۔ انھوں نے دراصل اس بات پر اتفاق کیا تھا کہ حاکم کو یہ اختیار ہے کہ بوقت ضرورت وہ استثنائی طور پر کسی فرد خاص کے بارہ میں اس طرح کا ایک فیصلہ دے جو فیصلہ خلیفہ دوم نے اپنے زمانہ میں دیا۔

صحابہ کا یہ اجماع ترمیم شریعت پر نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ اجماع صرف اس بات پر تھا کہ مسلمانوں کے حاکم کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی صواب دید کے مطابق کسی شخص خاص کے لیے ایک ایسے تعزیری حکم کا نفاذ کرے جو شریعت کے عمومی قانون میں ایک وقتی استثنا کی حیثیت رکھتا ہو۔ حاکم وقت کا یہ حق شریعت میں مسلّم ہے، اور نکاح و طلاق کے علاوہ دوسرے امور میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ جیسے قحط کے زمانہ میں چوری پر چور کا ہاتھ نہ کاٹنا۔

۹۔ آخری بات یہ کہ شریعت میں جس طرح مرد کو تفریق کا حق دیا گیا ہے اسی طرح عورت کو بھی تفریق کا حق حاصل ہے۔ البتہ عورت چونکہ پیدائشی طور پر جذباتی (emotional) واقع ہوئی ہے اس لیے دونوں کے طریق کار میں کسی قدر فرق رکھا گیا ہے۔ اس کی صورت مختصر طور پر یہ ہے کہ مرد کو تفریق کا جو اختیار طلاق کی صورت میں حاصل ہے، عورت کو وہی اختیار خلع اور تفویض طلاق کے ذریعہ دیا گیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ مرد اگر خلع کے لیے راضی نہ ہو تو عورت اپنے معاملہ کو قاضی کے پاس لے جائے گی اور قاضی پوری روداد سننے کے بعد حسب حالات دونوں کے درمیان تفریق کرا دے گا۔

اس کے علاوہ عورت کے لیے ایک اور صورت ہے جس کو نکاح تفویض کہا جاتا ہے۔ یعنی عورت نکاح کے وقت خود یا اپنے وکیل کے ذریعہ اپنے ہونے والے شوہر سے یہ باضابطہ عہد لے لے کہ شوہر اگر اس کے واجبی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہ ثابت ہو تو عورت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ خود اپنے فیصلہ سے اس کے ساتھ رشتۂ ازدواج کو توڑ دے اور اس سے علاحدہ ہو جائے۔ اس کی مزید تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

خلاصۂ کلام

اوپر کی بحث سے معلوم ہوا کہ طلاق کے لیے شریعت کا مقرر طریقہ یہ ہے کہ طلاق الگ الگ

بتدریج دی جائے، اور وہ لمبے وقفہ کے بعد مکمل ہو۔ یہی طلاق کا صحیح شرعی طریقہ ہے۔ تاہم ہر قانون کا غلط استعمال (misuse) ہوتا ہے، اسی طرح کچھ لوگ طلاق کے قانون کا بھی غلط استعمال کرتے ہیں اور ایک ہی مجلس میں بیک وقت اپنی بیوی کو تین طلاق دیدیتے ہیں۔

قانون کے اس طرح غلط استعمال کی صورت میں طلاق دینے والے کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، اس میں حسب حالات دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے تین طلاق کو لفظی تاکید پر محمول کرتے ہوئے اسے ایک ہی طلاق مانا جائے۔ اور اس کو رجعت کے حق سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی جائے۔

تاہم کسی شخص کو اس کے کیس کی مخصوص نوعیت کی بنا پر اس رخصت سے مستثنیٰ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کی سرکشی پر حاکم اسے تعزیری سزا دے سکتا ہے۔ یا اس کے تین طلاق کو تین طلاق قرار دے کر اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان جدائی بھی کرا سکتا ہے، تاکہ وہ اپنے گھر کی بربادی کی صورت میں اپنی غیر ذمہ دارانہ روش کی سزا بھگتے۔ نیز اس کا یہ فائدہ بھی ہے کہ ایسے افراد کے انحراف کے برے انجام کو دیکھ کر دوسرے لوگوں کو عبرت ہو اور آئندہ وہ اس قسم کے فعل کو دہرانے سے باز رہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں حضرت عمر فاروق کا انتظامی حکم اس لیے نہیں تھا کہ اس کو عمومی شرعی مسئلہ کی مانند مستقل طور پر رائج کر دیا جائے۔ وہ صرف اس لیے تھا کہ معاشرہ میں شرعی طریقہ سے انحراف کی حوصلہ شکنی ہو اور مشروع طریقہ پر طلاق دینے کا رواج از سر نو لوگوں کے درمیان قائم ہو جائے۔ خلیفہ دوم کا حکم ایک وقتی استثناء تھا نہ کہ کوئی مستقل شرعی مسئلہ۔ یہ وقتی استثناء بشرطِ ضرورت آئندہ بھی اختیار کیا جاسکتا ہے جس طرح وہ ماضی میں اختیار کیا گیا۔

تاہم اس کا حق صرف با اختیار حاکم کو ہے۔ یہ دراصل ایک انتظامی حکم تھا، اور انتظامی حکم کا حق صرف منتظم کو ہوتا ہے، عام آدمی کو ہرگز اس کا حق حاصل نہیں۔ کیوں کہ عام آدمی ان نتائج سے نپٹنے پر قادر نہیں جو اس قسم کے کسی حکم کے نفاذ کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔

جنگ اور امن اسلامی نقطۂ نظر سے

قرآن میں ہے کہ تم یکسو ہو کر اپنا رخ اس دین کی طرف کرلو ، اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے، اس کے بنانے کو بدلنا نہیں ہے، یہی سیدھا دین ہے (الروم ۳۰)

یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ ہر انسان جو اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ صحیح فطرت پر پیدا ہوتا ہے (کل مولودٍ یولد علی الفطرۃ) وہ اس ابدی فطرت کے عین مطابق ہے جو ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی تعلیمات میں اور عقل عام (Common sense) میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔

انسان اپنی فطرت کے تقاضے کے تحت چاہتا ہے کہ دنیا میں امن ہو۔ امن ہر آدمی کی پہلی خواہش ہے۔ فطرت کی آواز امن کی آواز ہے۔ کیوں کہ امن کے بغیر ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہر آدمی کو یکساں طور پر عمل کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ عقیدہ اور نظریہ کے اختلاف کے باوجود سوسائٹی میں پرامن فضا برقرار رہے۔

انسانی فطرت کا یہ تقاضا اسلام کا تقاضا بھی ہے۔ اس معاملہ میں یہی اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن میں ہے کہ خدا بے امنی کو پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲۰۵) خدا کو وہ لوگ پسند نہیں جو انسانی سماج کے اندر بگاڑ پیدا کرنے والے ہوں (المائدہ ۶۴)

فساد فی الارض

اسلام کا تصور امن یہ ہے کہ زمین کا نظام ابتدائی مرحلہ میں خالق نے جس طرح قائم کیا ہے اس کو ویسا ہی قائم رکھا جائے۔ اس میں کوئی فرق نہ کیا جائے۔ اس خدائی بندوبست میں گڑبڑ کرنا، اسی کا نام فساد فی الارض ہے (ہود ۱۱۶)

اس فساد فی الارض کے دو خاص پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ زمین پر خدا نے تقسیم رزق کا جو نظام بنایا ہے اس میں کوئی فرق پیدا نہ کیا جائے۔ مثلاً ایک دریا جس وسیع رقبہ زمین پر بہتا ہے، اس رقبہ کے تمام لوگوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا یکساں حق حاصل ہے۔ اگر کچھ لوگ بند بنا کر پانی کو اپنے لئے خاص کریں اور اسے دوسروں تک پہنچنے نہ دیں تو یہ فساد فی الارض

ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک ملک اپنی صنعتی سرگرمیوں کے ذریعہ ہوا میں گیسوں کے تناسب کو بدل دے اور لوگوں کو سانس لینے کے لئے ضروری مقدار میں آکسیجن نہ ملے تو یہ بھی فساد فی الارض ہوگا۔ اسی طرح ایسا اقتصادی نظام جو دولت کی گردش کو یک طرفہ کر دے یا اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کے نتیجہ میں مصنوعی قلت پیدا ہو جائے، یا جنگی جنون کے نتیجہ میں زمین کی دولت کا بڑا حصہ انسانی تعمیر کے بجائے انسانی تخریب میں استعمال ہونے لگے، تو یہ سب فساد فی الارض ہے، وغیرہ۔

عالمی نمونۂ عمل

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسانی دنیا کے نظام کو طبیعی دنیا کے نظام کے مطابق ہونا چاہئے۔ طبیعی دنیا کا نظام براہ راست خدا کا مقرر کیا ہوا ہے۔ وہ ربانی معیار پر قائم ہے۔ دوسری طرف انسانی دنیا کا نظام خود انسان اپنے ارادہ سے قائم کرتا ہے۔ یہاں انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنی زندگی کے نظام کو طبیعی دنیا کے نمونہ پر قائم کرے۔ طبیعی دنیا کے نمونہ کی پیروی کا نام اصلاح ہے اور اس سے انحراف کا نام فساد۔ اس کی ایک مثال ستاروں کا نظام ہے۔ خلا میں بے شمار ستارے ہیں۔ وہ سب کے سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر یہ تمام ستارے ہمیشہ اپنے مدار پر حرکت کرتے ہیں۔ وہ اپنے دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں داخل نہیں ہوتے۔ یہی وہ بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ اور سورج، وہ اپنی ٹھہری ہوئی راہ پر چلتا رہتا ہے۔ یہ عزیز و علیم کا باندھا ہوا اندازہ ہے۔ اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ وہ ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی شاخ۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں۔ (۳۸ — ۴۰ : ۳۶)

خلا میں لاتعداد چھوٹے بڑے ستارے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے مدار (Orbit) پر گھومتا ہے۔ کوئی ستارہ دوسرے ستارہ کی حد میں مداخلت نہیں کرتا۔ یہ گویا خدا کی طرف سے مقرر کیا ہوا ایک نمونۂ عمل (Role-model) ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ بھی اسی نمونہ پر عمل کرے۔ ایک انسان دوسرے انسان کی زندگی میں دخل اندازی کئے بغیر اپنی پوری زندگی

کا سفر جاری رکھے۔

یہی وہ بات ہے جو حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو۔ یہاں تک کہ ایک شخص دوسرے شخص پر فخر نہ کرے، اور ایک شخص دوسرے شخص پر زیادتی نہ کرے (ان اللہ اوحیٰ الیّ ان تواضعوا حتی لا یفخر احد علی احد ولا یبغی احد علیٰ احد، مشکوٰۃ المصابیح الجزء الثالث، صفحہ ۱۳۷۳)

جبر و اکراہ نہیں

قرآن میں اجتماعی زندگی کے بارہ میں جو احکام دئے گئے ہیں، ان میں سے ایک اہم حکم عدم اکراہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کسی پر جبر نہ کرے، کوئی کسی کو اس کی ناپسندیدہ چیز کو اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے۔ قرآن میں اس سلسلہ میں بنیادی اصول کے طور پر کہا گیا ہے کہ: لا اکراہ فی الدین (دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں)

اکراہ نہ کرنے کا یہ اصول یک طرفہ نہیں ہے بلکہ دوطرفہ ہے۔ یہی اصول داعی کے لئے ہے، اور یہی اصول مدعو کے لئے۔ اسی اصول کی پابندی ہر انسان کو کرنی ہے، خواہ وہ ایک مذہب یا نظام سے تعلق رکھتا ہو یا دوسرے مذہب اور نظام سے۔ اس کی تائید میں یہاں دو مثالیں قرآن سے نقل کی جاتی ہیں۔

قرآن میں ایک پیغمبر (حضرت شعیب) کی دعوتی مہم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان کی قوم نے ان کی دعوت کے جواب میں کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ ارشاد ہوا ہے کہ ان کی قوم کے بڑے، جو متکبر تھے، انھوں نے کہا کہ اے شعیب، ہم تم کو اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے، یا تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ۔ شعیب نے کہا، کیا ہم اس کو ناپسند کرتے ہوں تب بھی (الاعراف ۸۸)

پیغمبر کا یہ جواب بتاتا ہے کہ پیغمبر نے اصولاً اس کو درست نہیں قرار دیا کہ ان کی قوم کے لوگ انھیں اپنے دین (شرک) کو اختیار کرنے پر مجبور کریں۔ پیغمبر اپنی قوم کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھا کہ وہ اس کے سامنے اپنا دین پیش کریں، جس طرح خود پیغمبر اپنا دین ان کے سامنے

پیش کر رہا تھا۔ مگر وہ انھیں یہ حق دینے کے لئے تیار نہ تھا کہ وہ "تبلیغ" سے تجاوز کرکے "اکراہ" کے دائرہ میں داخل ہوجائیں۔ وہ کہنے سننے سے آگے بڑھ کر ان پر جبر کرنے لگیں۔

اس معاملہ کا دوسرا پہلو وہ ہے جو حضرت نوح کے تذکرہ کے ذیل میں بیان ہوا ہے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت پیش کی۔ قوم کے بڑوں نے آپ کی دعوت کو ماننے سے انکار کیا۔ اس کے بعد حضرت نوح نے کہا کہ اے میری قوم، بتاؤ، اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل پر ہوں۔ اور اس نے مجھ پر اپنے پاس سے رحمت بھیجی ہے، مگر وہ تم کو نظر نہیں آتی تو کیا ہم تم کو اس پر مجبور کرسکتے ہیں، جب کہ تم اس کو ناپسند کر رہے ہو (ہود ۲۸)

پیغمبر کا یہ جواب جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اگرچہ اپنے آپ کو صدفی صد برسر حق سمجھتا تھا، اس کے باوجود اس کے نزدیک یہ درست نہ تھا کہ وہ دوسروں کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرے۔

قرآن کے مطابق اکراہ (مجبور کرنا) ہر حال میں قابل ترک ہے۔ نہ داعی اور مصلح کو یہ حق ہے کہ وہ مدعو کو اپنی بات ماننے پر مجبور کرے اور نہ مدعو یہ حق رکھتا ہے کہ وہ داعی کو اپنے جبر کا نشانہ بنائے۔ دونوں فریقوں کے لئے ایک ہی صحیح پالیسی ہے اور وہ رواداری (Tolerance) ہے۔ یعنی دونوں کو اپنی بات کے اظہار کا پورا حق ہے۔ مگر دونوں میں سے کسی کو بھی جبر کا کوئی حق نہیں۔ کوئی شخص اپنی بات کو منوانے کے لئے اول و آخر جو چیز استعمال کرسکتا ہے وہ دلیل ہے نہ کہ عملی جبر یا دباؤ۔

جنگ برائے دفاع

اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم ہے، اور وہ دفاع (Defence) ہے۔ جارحانہ جنگ کسی بھی حال میں اسلام کے اندر جائز نہیں۔ قرآن میں ہے کہ — وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی۔ پھر جس نے معاف کردیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ بیشک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو شخص اپنے مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لے تو ایسے لوگوں کے اوپر کچھ الزام نہیں۔ الزام صرف ان پر ہے جو لوگوں کے اوپر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے لئے دردناک

عذاب ہے۔ اور جس شخص نے صبر کیا اور معاف کر دیا تو بے شک یہ ہمت کے کام ہیں (الشوریٰ ۳۹-۴۳)

اسلام میں جنگ کی حیثیت ایک ناگزیر برائی (Necessary evil) کی ہے۔ دوسروں کی طرف سے جارحیت پیش آنے کے بعد بھی اگر صبر اور اعراض اور گفت وشنید کے ذریعہ امن قائم کرنے کی امید ہو تو جنگ کے بدلے جنگ نہیں کی جائے گی۔ بلکہ صبر واعراض اور گفت وشنید کے ذریعہ منصفانہ حل تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔ اسلام میں جنگ صرف اس وقت ہے جب کہ جنگ کے سوا کوئی اور چارۂ کار سرے سے باقی نہ رہے۔

پیغمبر اسلام کے زمانہ میں آپ کے خلاف ہر قسم کی جارحیت کی گئی۔ مگر آپ نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ جنگ کو اوائڈ (Avoid) کریں۔ آپ کی پوری قولی اور عملی زندگی اسی اصول اعراض (Principle of avoidance) کا نمونہ ہے۔

مثلاً حدیبیہ (۶ھ) کے سفر میں خالد بن الولید ایک فوج لے کر آپ سے لڑنے کے لئے مکہ سے روانہ ہوئے۔ جب آپ کو یہ خبر معلوم ہوئی تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو جوابی تیاری کا حکم نہیں دیا بلکہ سادہ طور پر اپنا راستہ بدل دیا تاکہ دونوں فریقوں کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت ہی نہ آئے۔ اسی طرح غزوۂ احزاب (۵ھ) کے موقع پر آپ کے مخالفین بہت بڑا لشکر لے کر آئے تاکہ مدینہ پر حملہ کریں۔ آپ کو دشمن کی روانگی کی خبر ملی تو یہاں بھی آپ نے جوابی مقابلہ کا اہتمام نہیں کیا۔ اس کے برعکس آپ نے یہ کیا کہ مدینہ کی سرحدوں پر لمبی خندق کھود دی تاکہ آپ کے اور آپ کے دشمنوں کے درمیان ایک آڑ قائم ہو جائے اور دونوں فریقوں کے درمیان جنگ کی نوبت نہ آئے۔ حدیبیہ (۶ھ) کے موقع پر آپ کے حریف قریش آپ سے لڑنے کے لئے تیار تھے۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ہر قسم کی اشتعال انگیزی اور جارحیت کی۔ مگر آپ سب کچھ یک طرفہ طور پر برداشت کرتے رہے اور قریش پر کوئی جوابی حملہ نہیں کیا۔ آخر میں آپ نے خود قریش کی یک طرفہ شرائط کے تحت دس سالہ ناجنگ معاہدہ پر دستخط کر دئے۔

پیغمبر کا اسوہ

پیغمبر اسلام ۶۳ سال تک دنیا میں رہے۔ آپ کی پیغمبرانہ عمر ۲۳ سال تھی۔ اس مدت میں

آپ کے خلاف مسلسل طور پر بدترین قسم کی اشتعال انگیزی اور جارحیت کی گئی۔ مگر اس پوری مدت میں آپ نے ایک بار بھی اپنے مخالفین کے اوپر جارحانہ حملہ نہیں کیا۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں براہ راست طور پر صرف تین بار جنگ کی ہے، اور یہ تینوں جنگیں یقینی طور پر مدافعانہ تھیں ــــ بدر (۲ ھ) احد (۳ ھ) اور حنین (۸ ھ) صرف یہی تین جنگیں ہیں جن میں آپ نے براہ راست شرکت فرمائی۔ مگر یہ تینوں جنگیں وہ تھیں جن میں خود آپ کے مخالفین آپ کے اوپر حملہ آور ہوئے تھے۔ چوں کہ ان تینوں مواقع پر مدافعت کے سوا اور کوئی صورت نہ تھی اس لئے آپ نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ان کا مقابلہ کیا۔

اسلام میں امن ہے مگر جنگ نہیں، اسلام میں مدافعت ہے مگر جارحیت نہیں۔ اسلام میں رواداری ہے مگر تشدد نہیں۔ اسلام انسان کو دار السلام (سلامتی کے گھر) کی طرف لے جانا چاہتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی: واللہ یدعوا الی دار السلام (یونس ۲۵)

فطرت کے مطابق

ماسکو سے نکلنے والے انگریزی ماہنامہ اسپٹنک (Sputnik) کے شمارہ نومبر ۱۹۸۶ میں ایک مضمون چھپا ہے۔ اس میں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر ہے جو بہت سبق آموز ہے۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ سوویت یونین کے سابق پریسیڈنٹ یوری اینڈروپوف (Yuri Andropove) ۱۹۸۳ میں امریکہ گئے۔ جب وہ وہاں ایرپورٹ پر اترے تو ان کا استقبال کرنے والوں میں ۱۱ سال کی ایک امریکی لڑکی بھی تھی۔ اس کا نام سمنتھا اسمتھ (Samantha Smith) تھا۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ ایرپورٹ پر پہنچی تھی۔ وہ روسی صدر سے ملی اور اپنے معصومانہ انداز میں ان سے کہا کہ آپ جنگ چاہتے ہیں یا امن:

Are you for war or peace?

روسی صدر پر چھوٹی بچی کے اس سادہ جملہ کا بہت اثر ہوا۔ واپس لوٹنے کے بعد بھی وہ اس کو بھلا نہ سکے۔ جلد ہی بعد سمنتھا اسمتھ کو روسی صدر کا ایک خط ملا۔ جس میں اس کو حکومت روس کے مہمان کی حیثیت سے سوویت روس کا سفر کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق جون ۱۹۸۳ میں سمنتھا اسمتھ نے سوویت روس کا سفر کیا۔ سوویت روس کے دو ہفتہ دورہ کے بعد سمنتھا اسمتھ

نے اپنا تاثر بیان کرتے ہوئے کہا کہ اب میں مطمئن ہوں کہ روسی جنگ نہیں چاہتے :

Now I'm sure- the Russians don't want war

یہ چھوٹا سا واقعہ اپنے اندر ایک زبردست سبق رکھتا ہے۔ وہ بتاتا ہے انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے امن چاہتا ہے۔ ۱۱ سال کی ایک بچی جو ابھی اپنی ابتدائی فطرت پر تھی۔ جو ابھی مصنوعی تمدن کے اثرات سے آزاد تھی، اس کا مذکورہ سوال درحقیقت فطرت کا سوال تھا۔ اس کی فطرت ایک ایسی دنیا سے مطابقت نہیں کر پا رہی تھی جہاں جنگ کے نعرے ہوں جہاں گولی کی منطق سے معاملات کا فیصلہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہو۔ جہاں انسان اپنے جان و مال کو محفوظ نہ پاتا ہو۔ اسی نفسیات کے تحت اس نے روسی صدر سے مذکورہ سوال کیا۔

اسلام درحقیقت انسانی فطرت کی اسی پکار کا جواب ہے۔ جس خدا نے انسان کے اندر امن پسند فطرت بنائی ہے، اسی خدا نے دین اسلام بھی اتارا ہے جو سراسر امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن میں ان لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ اللہ امن و سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

خدا یہ چاہتا ہے کہ انسان دنیا میں امن و سلامتی کے ساتھ زندگی گزارے، تاکہ آخرت میں اس کو ابدی امن و سلامتی کے باغوں میں بسایا جائے۔ آخرت کی پر امن دنیا انھیں لوگوں کے لئے ہے جنھوں نے موجودہ دنیا میں پر امن رہنے کا ثبوت دیا ہو۔ کسی مومن کے لئے یہ سب سے بڑا محرک ہے جو اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں لوگوں کے ساتھ پر امن بن کر رہے۔ وہ دوسروں کے لئے مسئلہ پیدا کئے بغیر اپنا مسئلہ حل کرے۔

اسلامی جہاد کیا ہے

جہاد کے لفظی معنی ہیں کوشش کرنا۔ تاہم اس کے مفہوم میں مبالغہ ہے۔ یعنی اس کا مطلب ہے بہت کوشش کرنا، کسی مقصد کے حصول کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دینا۔ لسان العرب نے جہاد کے لفظ کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی نے کوشش کی اور اپنی کوشش میں اس نے مبالغہ کیا (جَهَدَ الرجلُ فی کذا أی جَدَّ فیہ وبالغَ) المفردات امام راغب میں ہے کہ انھوں نے اتنی کوشش کی جو آخری حد تک ان کے بس میں تھی (أن یأتوا بہ علیٰ ابلغ ما فِی وُسعِهِمْ)

مومن ایمان و اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے جو کچھ کرتا ہے وہ سب کا سب جہاد ہے۔ اس اعتبار سے شریعت میں جہاد کی تین قسمیں قرار پاتی ہیں ـــــ مجاہدۂ نفس، مجاہدۂ دعوت، مجاہدۂ اعداد۔

مجاہدۂ نفس تمام تر ایک شخصی جہاد ہے۔ یہ آدمی کی اپنی ذات کی سطح پر ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی ترغیبات سے لڑے۔ وہ نفسانی محرکات کا مقابلہ کرتے ہوئے دین خداوندی پر قائم رہے۔ اسی جہاد کی بابت حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ المجاهد من جاهد نفسه فی طاعة الله (مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے جہاد کرے) دوسری حدیث ہے: جاهدوا اهواءکم کما تجاهدون اعداءکم (تم لوگ اپنی خواہشوں سے جہاد کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو)

جہاد کی دوسری قسم مجاہدۂ دعوت ہے۔ یعنی خدا کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کے لئے اپنی ساری طاقت صرف کرنا۔ قرآن میں ہے: وجاهدهم به جهاداً كبيراً (الفرقان ۵۲) اس آیت میں بہ کی تفسیر ابن عباس نے بالقرآن سے کی ہے اور ابن زید نے بالاسلام سے (الجامع لاحکام القرآن ۱۳/۵۸) یعنی قرآن اور اسلام کی صورت میں جو دین تمھیں دیا گیا ہے، اس کے ذریعہ سے جہاد کبیر کرو۔ لوگ تعلیمات حق کے ابطال کے لئے اپنی کوشش صرف کر رہے ہیں، تم ان کے مقابلہ میں تعلیمات حق کے اثبات کے لئے اپنی ساری کوششیں لگا دو

(التفسیر المظہری ۷/ ۴۲)

جہاد کی تیسری قسم مجاہدۂ اعداء ہے۔ یعنی اسلام اور اہل اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا اور انھیں مجبور کرنا کہ وہ اپنی دشمنانہ روش سے باز آجائیں۔ اس جہاد کا دوسرا نام قتال فی سبیل اللہ ہے۔ پیش نظر مقالہ کا موضوع اصلاً جہاد کی یہی تیسری قسم ہے۔ اس لئے یہاں اس پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے گی۔

اصلاح خویش، انذار

قرآن کا مقصد نزول، قرآن کے بیان کے مطابق دو ہے ــــــ ایک یہ کہ مومن اس سے نصیحت لے کر اپنی اصلاح کریں۔ دوسرے یہ کہ غیر مومنوں کو وہ آنے والے یوم الحساب سے آگاہ کر دے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یہ ہے:

كتاب انزل اليك فلا يكن في صدرك حرج منه لتنذر به وذكرىٰ للمؤمنين (الاعراف ۲)

یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ پس تمہارا دل اس کے باعث تنگ نہ ہو، تاکہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈراؤ، اور وہ ایمان والوں کے لئے یاددہانی ہے۔

ذاتی اعتبار سے ایک مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والا ہو۔ اس کے اندر ہدایت طلبی اور نصیحت پذیری کا مزاج ہو۔ وہ کتاب الٰہی کی آیات سے سبق لے۔ وہ کائنات میں پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں کو اپنے لئے روحانی غذا بنائے (آل عمران ۱۹۱) اور اس طرح وہ اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کرے۔ وہ کونوا ربانیین کا مصداق بن جائے (آل عمران ۷۹)

اہل اسلام کے لئے دوسرا نشانہ وہ ہے جو خارجی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ خارجی دنیا کے لئے اہل اسلام کو جو نشانہ دیا گیا ہے وہ انذار و تبشیر یا دعوت الی اللہ ہے۔ یہی واحد خارجی عمل ہے جس میں اصلاً مسلمانوں کو مشغول ہونا ہے۔ خارجی قومیں ہمارے لئے قتال کا موضوع نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہمارے لئے دعوت و نصیحت کا موضوع ہیں۔ ان کے سلسلہ میں ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم لوگوں کو خدا کے دین کی طرف بلائیں اور مسلسل انھیں اس کی طرف بلاتے رہیں۔ مسلمان کے خارجی

عمل کی بنیاد ، ایک لفظ میں ، دعوتی عمل (dawah activism) ہے نہ کہ جنگ وقتال کا عمل۔

اسلام میں اصل اقدامی عمل دعوت ہے۔ اسی سے ان کے لئے ہر قسم کی خارجی کامیابیوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ اہل ایمان کو اپنی ذاتی اصلاح کے بعد دوسرا جو عمل کرنا ہے وہ دعوت اور صرف دعوت ہے۔ اہل ایمان کا خارجی عمل اول بھی دعوت ہے اور آخر بھی دعوت۔ اہل ایمان اور دوسری قوموں کے درمیان حقیقۃً داعی اور مدعو کا تعلق ہے نہ کہ حریف اور رقیب کا تعلق۔

تاہم موجودہ دنیا میں انسان آزاد ہے۔ وہ اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتے ہوئے کبھی تشدد پر اتر آتا ہے، وہ دوسرے کے اوپر جارحانہ حملے کرتا ہے۔ اس طرح بعض اوقات دوسروں سے مقابلہ اور ٹکراؤ کی نوبت آجاتی ہے۔ تاہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ دعوت اسلام کا اصولی تقاضا ہے اور جنگ اسلام کا صرف وقتی تقاضا۔

اسلام میں بلاشبہہ قتال کے مواقع بھی پیش آئے ہیں اور آئندہ بھی وہ پیش آسکتے ہیں۔ مگر قتال اسلام کا اصل کام یا اس کا اصل نشانہ نہیں۔ اسلام میں دعوت اس کا اصل جزء ہے اور قتال اس کا صرف اضافی جزء۔ یعنی دعوت تو ہر مقام پر اور ہر حال میں ابدی طور پر جاری رہے گی۔ مگر قتال صرف اس وقت کیا جائے گا جب کہ وہ اتفاقی حالات پیش آجائیں جن میں شریعت نے اپنے ماننے والوں کو قتال کی اجازت دی ہے۔ دعوت ہر قسم کے حالات کے لئے ہے اور قتال صرف مخصوص حالات کے لئے۔ (دعوت کے موضوع پر مزید تفصیل کے لئے: دین کامل)

جہاد برائے دفاع

رسول اور اصحاب رسول کو اپنی زندگی میں جو غزوات پیش آئے، وہ اصلاً دفاعی تھے۔ اس کا ثبوت قرآن میں واضح طور پر موجود ہے۔ قرآن میں اہل ایمان کو مشرکین سے قتال کا حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے:

ألا تقاتلون قوما نكثوا أيمانهم وهموا بإخراج الرسول وهم بدؤكم أول مرة.	کیا تم ایسے لوگوں سے نہ لڑوگے جنھوں نے اپنے عہد کو توڑا اور انھوں نے رسول کو نکالنے کا قصد کیا اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے پہل کی۔

اس آیت میں قرآن نے جنگ کا آغاز کرنے کی ذمہ داری واضح طور پر اسلام کے مخالفوں پر ڈالی ہے۔ اور جب خود قرآن کے مطابق، مخالفین کا گروہ بادئی (ابتدا کرنے والا) ہو تو اس کے بعد بلا شک یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو جنگیں پیش آئیں ان میں مخالفین کی حیثیت لڑائی کا آغاز کرنے والے کی تھی اور آپ کی حیثیت دفاع کرنے والے کی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مہاجر صحابہ کا وطن مکہ تھا۔ آپ نے مکہ میں پر امن طور پر توحید کی دعوت شروع کی۔ اہل مکہ کے ساتھ آپ نے کسی بھی قسم کی کوئی عملی نزاع کھڑی نہیں کی۔ اس کے باوجود وہ آپ کے اور آپ کے اصحاب کے دشمن ہو گئے۔ انھوں نے جارحانہ انداز اختیار کر کے ایسے سخت حالات پیدا کئے کہ آپ کے اصحاب اپنا وطن چھوڑ کر باہر جانے پر مجبور ہو گئے۔

اس کے بعد مکہ کے منکرین خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے ہو گئے۔ چنانچہ اپنے قومی طریقہ کے مطابق وہ دار الندوہ میں جمع ہوئے تاکہ کوئی اجتماعی فیصلہ کر سکیں۔ مشورہ میں کسی نے کہا کہ محمد کو پکڑ کر ایک کوٹھری میں بند کر دو یہاں تک کہ اسی میں ان کی موت آجائے۔ کسی نے کہا کہ ان کو مکہ سے جلا وطن کر دو۔ کسی نے کہا کہ مل کر انھیں قتل کر دو تاکہ یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے (سیرۃ ابن ہشام ۲/۹۳ - ۹۵)

مکہ کے اسی واقعہ کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے: اور جب انکار کرنے والے تمہاری نسبت تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلا وطن کر دیں۔ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے اور اللہ اپنی تدبیریں کر رہا تھا۔ اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے (الانفال ۳۰)

دار الندوہ کے مشورہ کے مطابق، مشرکین مکہ نے یہ کیا کہ تلواریں لے کر مکہ میں آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ اپنے قبائلی رواج کے مطابق، وہ گھر کے اندر داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر انھوں نے اس بات کا قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ صبح کو جب آپ حسب معمول گھر کے باہر نکلیں تو سب مل کر دفعۃً آپ پر تلواروں کا حملہ کریں اور آپ کو قتل کر ڈالیں۔ مگر اللہ اپنے پیغمبر کا محافظ تھا۔ اس نے محاصرہ کرنے والوں پر نیند طاری کر دی، اور آپ رات ہی کو مکہ سے نکل کر مدینہ کے لئے روانہ ہو گئے اور بحفاظت وہاں پہنچ گئے۔

روایات میں آتا ہے کہ اصحاب رسول جب ہجرت کرکے مدینہ آگئے تب بھی وہ ہروقت اپنے ساتھ تلوار رکھتے تھے۔ حتی کہ رات کے وقت بھی وہ تلوار لے کر سوتے تھے۔ کیوں کہ مستقل اندیشہ تھا کہ اہل مکہ کسی بھی وقت اقدام کرکے ان کے اوپر حملہ کر دیں گے۔ ہجرت کے بعد اہل مکہ کے جارحانہ عزائم ایک مسلّمہ حقیقت بن چکے تھے۔

مشرکین عرب کا یہ رویہ قرآن کے نزدیک، مکمل طور پر جارحیت کے ہم معنی تھا۔ اب رسول اور اصحاب رسول کو یہ حق ہوگیا کہ وہ دفاع کے اصول کے تحت مشرکین عرب سے جنگ کرسکیں۔ ہجرت کے بعد بدر کے موقع پر اس کا وقت آگیا۔ اس طرح بدر اور اس کے بعد کی تمام چھوٹی بڑی لڑائیاں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں پیش آئیں وہ سب دفاعی جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان تمام جنگوں میں اہل شرک کی حیثیت جارح کی تھی اور اہل اسلام کی حیثیت مدافع کی۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ فریق ثانی کی طرف سے جب جنگ کا آغاز کر دیا جائے تو اس کے بعد دفاع اور جارحیت کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ ایک بار جارحیت کا واقعہ پیش آنے کے بعد فریق ثانی کو جائز طور پر یہ حق مل جاتا ہے کہ وہ اپنے جارح دشمن کو زیر کرنے کے لئے جو بھی جوابی کارروائی مناسب سمجھے اس کو اختیار کرے۔ بین اقوامی رواج کے مطابق، یہ ایک مانا ہوا اصول ہے۔ اس کے جواز اور معقولیت سے کسی کو اختلاف نہیں۔

اس مسلّمہ اصول کی روشنی میں، بدر کی جنگ ہر حال میں دفاعی جنگ قرار پاتی ہے، خواہ یہ کہا جائے کہ مسلمانوں نے اس موقع پر آگے بڑھ کر مشرکین کے اوپر حملہ کیا یا یہ کہا جائے کہ مشرکین کا لشکر پہلے حملہ آور ہوا اور اہل اسلام اس سے مقابلہ کے لئے مدینہ سے نکل کر بدر کے مقام پر پہنچے۔ اپنے وطن سے جابرانہ طور پر جلا وطن کئے جانے کے بعد ان کے لئے دونوں ہی جنگ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دفاعی جنگ کے حکم میں شمار کی جائے گی۔

ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پرامن طور پر مدینہ میں رہنے لگے۔ مگر اہل مکہ نے آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ نا گوارا نہیں کیا۔ جمادی الاولیٰ ۲ھ میں یہ واقعہ ہوا کہ اہل مکہ کا ایک مسلح دستہ کرز بن جابر الفہری کی قیادت میں آیا۔ اس نے مدینہ کے قریب کی ایک چراگاہ

پر رات کو حملہ کیا اور مسلمانوں کے اونٹ اور بکریاں لے کر بھاگ گیا۔ اسلام کی تاریخ میں اس کو غزوۂ بدر الاولیٰ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اسی سال رمضان ۲ھ میں وہ غزوہ پیش آیا جس کو اسلام کی تاریخ میں غزوۂ بدر الثانیہ کہا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اہل مکہ کی طرف سے جارحیت کا آغاز بدر اول میں ہو چکا تھا۔ بدر ثانی اس کے بعد اسی کے جواب میں دفاعی کارروائی کے طور پر پیش آیا۔

مدافعانہ جنگ کو ہمیشہ ہر فرد اور ہر قوم کا جائز حق سمجھا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اقوام متحدہ کا آرٹیکل ۵۱ ذاتی دفاع (self-defense) سے متعلق ہے۔ اس پر تمام دنیا کی قوموں نے دستخط کئے ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ایک ریاست اپنی ذات میں اس کا حق رکھتی ہے کہ وہ انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنا دفاع کرے جب کہ اس کے خلاف مسلح حملہ کر دیا گیا ہو:

a state has the inherent right of individual or collective self-defense if an armed attack occurs against it. (19/540).

انٹرنیشنل قانون کے ماہرین نے اس آرٹیکل کی تشریح میں مزید اضافہ کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ دنیا کے مسلّمہ رواج کے مطابق، جارحیت کو واقعی مسلح حملہ (actual armed attack) تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ریاستیں دفاع کا وہ مزید وسیع تر حق بھی رکھتی ہیں جو بین اقوامی قانون کے تحت اقوام متحدہ کے چارٹر سے پہلے انھیں حاصل تھا۔ اس میں کسی حملہ کے ناگزیر ہو جانے کی صورت میں اس کو روکنے کا اقدام کرنا بھی شامل ہے:

In addition, states also retain the broader right of self-defense that international law gave them before the Charter came into effect, including preventive action against an imminent attack. (19/540).

مسلّمہ بین اقوامی رواج کے مطابق، ہر فرد اور ہر قوم کو یہ حق ہے کہ وہ بوقت جارحیت اپنا دفاع کرے۔ قدیم زمانہ میں بھی اس کو تسلیم کیا جاتا تھا اور موجودہ زمانہ میں اقوام متحدہ کے چارٹر کی صورت میں وہ باضابطہ طور پر تسلیم شدہ حق کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

قرآن میں مختلف الفاظ میں اہل اسلام کو دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ یہاں ہم صرف دو آیتیں نقل کرتے ہیں۔ اختلاف روایت کے ساتھ یہ سب سے پہلی آیتیں ہیں جو قتال کے

بارہ میں قرآن میں اتریں :

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا (البقرہ ۱۹۰) — اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی نہ کرو۔

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا (الحج ۳۹) — (لڑنے کی) اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن سے لڑائی کی جارہی ہے اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

آیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ ان میں اہل ایمان کو جس جنگ کا حکم دیا گیا ہے وہ واضح طور پر مدافعانہ جنگ ہے۔ اس میں بدء کا فعل (التوبہ ۱۳) فریق ثانی کی طرف سے ہو چکا ہے۔ اس کی ظالمانہ کارروائی پہلے ہی وقوع میں آچکی ہے۔ اس کا جارح ہونا مسلّم طور پر ایک ثابت شدہ واقعہ بن چکا ہے۔ اس کے بعد اہل اسلام کو ہدایت دی جارہی ہے کہ ان جارح لوگوں کے خلاف مدافعانہ جنگ کرو۔

اسلام میں پہلی باقاعدہ جنگ بدر کی صورت میں پیش آئی۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر غزوۂ احد اور غزوۂ حنین کا ذکر کیا جاتا ہے۔

غزوہ احد شوال ۳ ھ میں پیش آیا۔ بدر کے موقع پر اگرچہ قریش کو فوجی شکست ہوئی تھی۔ مگر ان کا کاروان تجارت بچ کر کہ واپس آگیا تھا۔ اس تجارت سے حاصل شدہ ساری رقم دار الندوہ میں پوری طرح محفوظ تھی۔ اب لوگوں کے اندر بدر کا انتقام لینے کا جذبہ ابھرا۔ سرداران قریش نے مشورہ کر کے یہ طے کیا کہ جو تجارتی رقم محفوظ ہے اس کا اصل سرمایہ توشرکاء کے درمیان ان کے حصہ کے بقدر تقسیم کر دیا جائے۔ اور منافع کی رقم سب کی سب ایک نئی جنگ کی تیاری میں استعمال کی جائے۔ یہ زر منافع تقریباً پچاس ہزار دینار تھا۔ وہ سب کا سب مجوزہ فوجی مہم کے لئے خاص کر دیا گیا۔ یہی واقعہ ہے جس کی طرف سورہ الانفال کی آیت ۳۶ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

قریش نے غیر معمولی تیاری کی۔ حتی کہ انھوں نے مکہ کی ۱۵ عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لیا تاکہ وہ رجزیہ اشعار پڑھیں اور ہمت ہارنے والوں کو غیرت دلائیں۔ مکہ اور دیگر قبائل کے تین ہزار مسلح آدمی مکہ سے نکل کر مدینہ کے لئے روانہ ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مستقل طور پر حالات کی خبر لیتے رہتے تھے۔ آپ کے مخبروں نے بتایا کہ قریش کا لشکر چلتے ہوئے مدینہ کے

قریب پہنچ گیا ہے۔

پوری معلومات حاصل کر لینے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو جمع کر کے مشورہ پوچھا۔ کچھ لوگوں کی رائے ہوئی کہ ہم مدینہ میں ٹھہریں اور جب قریش کا لشکر مدینہ میں داخل ہو جائے اس وقت اس سے مقابلہ کریں۔ دوسرے طبقہ نے اس کو کمتر سمجھا اور یہ رائے دی کہ مدینہ سے باہر نکل کر ان کا مقابلہ کیا جائے۔ آخر کار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے گروہ کی رعایت کی اور مدینہ سے نکلنے کا حکم دے دیا۔

روایات کے مطابق، ۱۱ شوال کو آپ ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مقابلہ کے لئے نکلے۔ مگر راستہ میں عبداللہ ابن ابی اور اس کے ساتھی اختلاف کر کے لشکر سے الگ ہو گئے اور مدینہ واپس آ گئے۔ ان کی تعداد تقریباً تین سو تھی۔ مدینہ کے باہر احد پہاڑ کے قریب دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

احد کی جنگ میں واضح طور پر قریش نے بڑھ کر حملہ کیا تھا اور اہل اسلام کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنا دفاع کریں۔ مکہ سے مدینہ کا فاصلہ تقریباً ۳۰۰ میل ہے۔ یہ جنگ مدینہ کی سرحد پر ہوئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے لوگ مکہ سے ۳۰۰ میل کا فاصلہ طے کر کے مسلمانوں کے علاقہ میں آئے۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس جنگ میں اہل شرک کی حیثیت جارح کی تھی اور اہل اسلام کی حیثیت مدافع کی۔

دفاعی جنگ کی دوسری واضح مثال وہ ہے جس کو غزوہ حنین کہا جاتا ہے۔ یہ غزوہ شوال ۸ھ میں پیش آیا۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کے سفر کا ارادہ فرمایا۔ درمیان میں قبیلہ ہوازن کی بستیاں تھیں۔ آپ کا کوئی ارادہ قبیلہ ہوازن سے تعرض کرنے کا نہ تھا۔ مگر اس قبیلہ کا سردار مالک بن عوف فتح مکہ کی خبر سن کر آپ کا دشمن ہو گیا۔ اس نے قبیلہ ہوازن اور قبیلہ ثقیف میں جوشیلی تقریریں کر کے انھیں آپ کے خلاف بھڑکا دیا۔ یہ لوگ تقریباً بیس ہزار کی تعداد میں آپ کے خلاف جمع ہو گئے۔

مالک بن عوف ان کو لے کر مقام اوطاس پہنچا۔ یہاں اس نے یہ طے کیا کہ ہم لوگ پہاڑوں اور جھاڑیوں میں چھپ جائیں۔ اور مسلمانوں کی جمعیت جب طائف جاتے ہوئے یہاں سے گزرے

تو یکبارگی ان پر حملہ کر دیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اپنے مخبروں کے ذریعہ مالک بن عوف کے منصوبہ کی خبر ہوگئی تھی۔ آپ نے احتیاطی طور پر مزید تیاری کا اہتمام کیا اور مکہ سے ۱۲ ہزار آدمیوں کے ساتھ نکل کر روانہ ہوئے۔

اہل اسلام کی یہ جمعیت مکہ اور طائف کے درمیان ایک مقام پر پہنچی جس کو حنین کہا جاتا تھا۔ یہاں ایک وادی تھی۔ اور اس کے دونوں طرف پہاڑیاں تھیں۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھی جب وادی میں داخل ہوئے تو منصوبہ کے مطابق مالک بن عوف کے آدمیوں نے دونوں طرف سے نکل کر آپ کے اوپر یکبارگی حملہ کر دیا۔ وہ لوگ تیراندازی کے ماہر تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے اوپر تیروں کی بارش شروع کر دی۔

اس زبردست حملہ کے نتیجہ میں مسلمان دفاع پر مجبور ہو گئے۔ اس مقابلہ میں اولاً ان کو شکست ہوئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں مالک بن عوف اور ان کے لشکر کے اوپر فتح عطا فرمائی۔ اس واقعہ کی تفصیلات سیرت کی کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

حنین کی یہ جنگ واضح طور پر ایک دفاعی جنگ تھی۔ اس جنگ میں ہوازن اور ثقیف کی حیثیت یقینی طور پر جارح کی تھی اور رسول اور اصحاب رسول کی حیثیت یقینی طور پر مدافع کی (اس بحث میں تین غزوہ کا ذکر الگ الگ کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ غزوات ہر اعتبار سے الگ ہیں۔ ان کی علیحدگی علامتی ہے نہ کہ حقیقی)

جنگ کا اصلاحی رخ

رسول اور اصحاب رسول کے زمانہ میں جو لڑائیاں پیش آئیں وہ اپنی حربی نوعیت کے اعتبار سے دفاعی تھیں۔ مگر جب فریق ثانی کی جارحیت کے نتیجہ میں لڑائی پیش آگئی تو اسلام نے اس کو اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا دیا۔

دفاعی جنگ کو مقصدی جنگ یا مصلحانہ جنگ بنا دینا ایسا ہی ہے جیسے شر کو خیر کا ذریعہ بنا دینا۔ دوسروں نے جو چیز شر کے طور پر اٹھائی تھی اس کو اسلام نے خیر کی طرف موڑ دیا۔ اس سلسلہ میں دو خاص مثالیں اگلے صفحات میں نقل کی جا رہی ہیں۔ ایک، منکرین رسالت پر سنت الٰہی کا اجراء۔ اور دوسرے، مشرکانہ جبر کے فتنہ کا استیصال۔

منکرین رسول کی تعذیب

پیغمبر خدا کی زمین پر خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے معاملہ میں خدا کی ایک خاص سنت ہے جس کا ظہور کسی ایک یا دوسری صورت میں ہر پیغمبر کے زمانہ میں ہوتا رہا ہے۔ وہ سنت یہ ہے کہ پیغمبر جب اپنی مخاطب قوم پر اتمام حجت کی حد تک دعوت پہنچا دے۔ مگر وہ قوم اس کے باوجود پیغمبر کا انکار کرے۔ حتی کہ اس کی ظالمانہ کارروائیوں کی بنا پر پیغمبر کو اپنے وطن سے ہجرت کرنا پڑے۔ جب کسی قوم کی طرف سے اس قسم کا ردعمل پیش آئے تو اس کے بعد اس قوم کی مہلتِ عمر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کو ہلاک کر دیا جاتا ہے تاکہ اگلی دنیا میں پہنچ کر وہ اپنے کردار کا انجام بھگتے۔ قرآن میں یہ قانون مختلف مواقع پر بیان ہوا ہے۔ ایک آیت یہ ہے:

وان کادوا لیستفزونك من الارض لیخرجوك منها واذاً لا یلبثون خلافك الا قلیلا۔ سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا (۱۷: ۷۶ - ۷۷)

اور یہ لوگ اس سرزمین سے تمہارے قدم اکھاڑنے لگے تھے تاکہ تم کو اس سے نکال دیں۔ اور اگر ایسا ہوتا تو تمہارے بعد یہ بھی بہت کم ٹھہرنے پاتے۔ جیسا کہ ان رسولوں کے بارہ میں ہمارا طریقہ رہا ہے جن کو ہم نے تم سے پہلے بھیجا تھا اور تم ہمارے طریقہ میں تبدیلی نہ پاؤ گے۔

اتمام حجت کے بعد پیغمبروں کے منکرین پر خدا کے اس فیصلہ کا نفاذ بار بار ہوا ہے۔ تاہم قدیم زمانہ میں یہ نفاذ زیادہ تر زمینی یا آسمانی آفتوں کی صورت میں ہوا۔ قرآن میں اس تاریخ کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فکلا اخذنا بذنبه فمنهم من ارسلنا علیه حاصبا ومنهم من اخذته الصیحة ومنهم من خسفنا به الارض ومنهم من اغرقنا۔ وما کان الله لیظلمهم ولکن کانوا انفسهم یظلمون (۲۹/ ۴۰)

پس ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہ میں پکڑا۔ پھر ان میں سے بعض پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی ہوا بھیجی۔ اور ان میں سے بعض کو کڑک نے آپکڑا۔ اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا۔ اور ان میں سے بعض کو ہم نے غرق کر دیا۔ اور اللہ ان پر ظلم کرنے والا نہ تھا۔ مگر وہ خود اپنی جانوں پر ظلم

کر رہے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ استثنائی طور پر یہ صورت پیش آئی کہ اگرچہ ایک طبقہ نے آپ کی دعوت کا انکار کیا۔ مگر اسی کے ساتھ بہت سے لوگ آپ کی دعوت سے متاثر ہوئے۔ اس طرح آپ کے گرد اہل ایمان کی ایک طاقت ور جماعت اکٹھا ہوگئی۔ اس بنا پر آپ کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کی یہ مشیت ہوئی کہ خود آپ کے مومنین کو آپ کے منکرین کے اوپر خدائی فیصلہ کے نفاذ کا ذریعہ بنایا جائے۔ یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ انی لم ابعث لاعذب بعذاب اللہ انما بعثت لضرب الرقاب وشد الوثاق (تفسیر ابن کثیر ۲/۲۹۳) یہی بات ہے جو قرآن میں ان لفظوں میں مذکور ہے کہ قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم (التوبہ ۱۴) یعنی منکرین رسول جن کے اوپر حجت پوری ہوچکی ہے ان سے جنگ کرو۔ اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ تمہارے ہاتھوں سے ان کے اوپر وہ عذاب نازل کرے جو ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:

فھذہ حکمۃ شرع اللہ جھاد الکفار بایدی المومنین لاجلھا وقد کان تعالیٰ انما یعاقب الامم السالفۃ المکذبۃ للانبیاء بالقوارع التی تعم تلک الامم المکذبۃ کما اھلک قوم نوح بالطوفان وعادا الاولیٰ بالدبور وثمود بالصیحۃ وقوم لوط بالخسف وقوم شعیب بیوم الظلۃ (تفسیر ابن کثیر ۲/۲۹۱)

یہی وہ حکمتیں ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے مومنین کے ہاتھوں کفار کے جہاد کو مشروع کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کا انکار کرنے والی پچھلی امتوں کو مہلک آفتوں کے ذریعہ سزا دیتا رہا ہے جو تمام منکر امت کے لئے عام ہوتی تھی۔ جیسا کہ اللہ نے قوم نوح کو طوفان سے ہلاک کیا اور قوم عاد کو آندھی سے اور قوم ثمود کو چنگھاڑ سے اور قوم لوط کو دھنسا دینے سے اور قوم شعیب کو سائبان والے دن کی آفت سے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے براہ راست مخاطب مکہ کے قریش تھے۔ مکی دور کے آخر میں جب یہ ثابت ہوگیا کہ پیغمبر نے انھیں اپنا پیغام پوری طرح پہنچا دیا ہے اور اس کے باوجود وہ انکار کی روش پر جمے ہوئے ہیں تو اس وقت یہ اعلان کیا گیا کہ فقد کذّبتم فسوف یکون لزاما (الفرقان ۷۷) یعنی اب تم آخری طور پر جھٹلا چکے، پس عنقریب تم سے ہونی ہے مڈبھیڑ۔ یہ آیت گویا ایک مرحلہ کے خاتمہ اور دوسرے مرحلہ کے آغاز کا اعلان ہے۔

تاریخی شواہد کے مطابق ، بدر کی جنگ اصلاً مشرکین مکہ کی جارحیت کے نتیجہ میں پیش آئی ۔ یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے پورے معنوں میں ایک دفاعی جنگ تھی ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ سے اس میں مقصدی پہلو شامل کر دیا ۔ اس جنگ کو وہ موقع بنا دیا گیا جس کے ذریعہ منکرین حق کو ان کے انکار کی وہ سزا دی جائے جو سنت الٰہی کے مطابق منکر قوموں کے لئے مقدر ہے ۔

بدر کی جنگ جن لوگوں سے لڑی گئی وہ اس سے پہلے مکہ میں واضح جارحیت کا مظاہرہ کر چکے تھے ۔ اس طرح وہ اس کا جواز فراہم کر چکے تھے کہ ان کے خلاف دفاعی کارروائی کی جائے ۔ مذکورہ مصلحت کی بنا پر مکہ میں ان کے خلاف دفاعی کارروائی نہیں کی گئی ۔ کیوں کہ دفاعی کارروائی کے ساتھ تعذیب کا پہلو شامل تھا ۔ اور اس قسم کی تعذیب ہمیشہ رسول کی ہجرت کے بعد ہوتی ہے ۔ وہ کبھی ہجرت سے پہلے نہیں ہوتی ۔

اس مخصوص پہلو نے بدر کی جنگ کو ایک خصوصی جنگ بنا دیا ۔ اس کا ایک قرینہ یہ ہے کہ یہ واحد جنگ تھی جس میں فرشتے اہل اسلام کی طرف سے لڑنے کے لئے اترے ۔ اس ایک جنگ کے سوا کسی اور جنگ میں فرشتے لڑائی لڑنے کے لئے نہیں اتارے گئے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کرکے مکہ سے مدینہ آ گئے تو قریش کے درمیان یہ تحریک اٹھی کہ مدینہ پر حملہ کرکے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا جائے ۔ اس مقصد کے لئے تمام اہل مکہ کے چندہ سے رقم جمع کی گئی اور ابوسفیان کی سرکردگی میں ایک تجارتی قافلہ شام بھیجا گیا اور یہ طے پایا کہ اس تجارت سے جو نفع ہوگا وہ سب کا سب مدینہ کے خلاف لشکر کشی میں استعمال کیا جائے گا ۔

آخر شعبان ۲ ھ میں قریش کا یہ قافلہ اموال تجارت لے کر شام سے مکہ کی طرف روانہ ہوا ۔ اس قافلہ میں ایک ہزار اونٹ تھے جن کے اوپر مختلف قسم کے سامان لدے ہوئے تھے ۔ شام سے مکہ کا راستہ مدینہ کے قریب سے گزرتا تھا ۔ رسول اور اصحاب رسول نے یہ طے کیا کہ اس قافلہ پر چھاپہ مارا جائے ۔ اس مقصد کے لئے ۳۱۳ مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ روانہ ہوئے ۔

اپنے جاسوسی نظام کے تحت قریش کو اس کا علم ہو گیا کہ مسلمان تجارتی قافلہ کو روکنے کے لئے مدینہ سے نکل رہے ہیں ۔ انھوں نے مکہ میں منادی کرائی کہ تمام قابل جنگ مرد ہتھیاروں کے ساتھ نکلیں تاکہ محمدؐ کا مقابلہ کرکے ان کا اور ان کے دین کا خاتمہ کر دیا جائے ۔ اس طرح اب مقابلہ کے لئے

دشمن کے دو گروہ ہو گئے۔ ایک تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تقریباً چالیس آدمی بطور محافظ تھے۔ دوسرے قریش کا لشکر جس میں ایک ہزار جنگجو ہتھیاروں کے ساتھ مدینہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس سلسلہ میں سورہ الانفال کی حسب ذیل آیتوں کا مطالعہ کیجئے:

جیسا کہ تمہارے رب نے تم کو حق کے ساتھ تمہارے گھر سے نکالا اور مسلمانوں میں سے ایک گروہ کو یہ ناگوار تھا۔ وہ اس حق کے معاملہ میں تم سے جھگڑ رہے تھے باوجودیکہ وہ ظاہر ہو چکا تھا، گویا کہ وہ موت کی طرف ہانکے جا رہے ہیں آنکھوں دیکھتے۔ اور جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دو جماعتوں میں سے ایک تم کو مل جائے گی اور تم چاہتے تھے کہ جس میں کانٹا نہ لگے وہ تم کو ملے۔ اور اللہ چاہتا تھا کہ وہ حق کا حق ہونا ثابت کر دے اپنے کلمات سے اور منکروں کی جڑ کاٹ دے تاکہ حق حق ہو کر رہے اور باطل باطل ہو کر رہ جائے خواہ مجرموں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ جب تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری فریاد سنی کہ میں تمہاری مدد کے لئے ایک ہزار فرشتے لگاتار بھیج رہا ہوں ... جب تیرے رب نے فرشتوں کو حکم بھیجا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم ایمان والوں کو جمائے رکھو۔ میں کافروں کے دل میں رعب ڈال دوں گا۔ پس تم ان کی گردن کے اوپر مارو اور ان کے پور پور پر ضرب لگاؤ (۵ - ۱۲)

قرآن میں غزوۂ بدر کو یوم الفرقان (الانفال ۴۱) کہا گیا ہے۔ اس دن اللہ نے اپنی خصوصی مدد اتاری تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ ہلاک ہو اور جس کو زندگی حاصل کرنا ہے وہ روشن دلیل کے ساتھ زندہ رہے (الانفال ۴۲)

ابن اسحاق نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے روایت کیا ہے کہ فرشتوں نے غزوۂ بدر کے سوا کسی اور غزوہ میں جنگ نہیں کی (لم تقاتل الملائکة فی یوم سوی یوم بدر من الایام) سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۷۴

بدر ایک کنویں کا نام تھا۔ یہ جگہ مدینہ سے ۸۰ میل کے فاصلہ پر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کے معرکہ سے فارغ ہو کر واپس ہوئے۔ آپ روحاء کے مقام پر پہنچے تو مسلمان آگے بڑھ کر آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو اس فتح کی خوشخبری دی جو اللہ نے انھیں عطا کی تھی۔ اس وقت ایک بدری سلمہ بن سلامہ نے کہا:

ما الذی تمنؤننا به۔ فواللہ ان لقینا الّا عجائز صُلعا کالبدن المعلقة فنحرناها (سیرۃ ابن ہشام ۲/۲۸۶)

تم ہم کو کس چیز کی مبارک باد دے رہے ہو۔ خدا کی قسم، ہم کو تو بوڑھے گنجے لوگوں سے مقابلہ پیش آیا۔ وہ قربانی کے بندھے ہوئے اونٹوں کی مانند تھے، پس ہم نے ان کو ذبح کر دیا۔

بدر کی جنگ اپنی ظاہری نوعیت کے اعتبار سے بلاشبہ دفاعی تھی۔ مگر جب فریق ثانی کا انکار مزید آگے بڑھ کر جارحیت بن گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی سنت کے اجراء کا ذریعہ بنا دیا۔ اس وقت اہل اسلام کی تعداد بہت کم تھی۔ ان کے مقابلہ میں اہل انکار بہت زیادہ طاقت ور حیثیت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے لیقضی اللّٰه امراً کان مفعولا (الانفال ۴۴) کے تحت فرشتوں کی فوج بھیج کر اس کمی کی حسن تلافی کا انتظام کر دیا۔

بدر کے علاوہ جنگوں میں بھی ایک حد تک بدر والا پہلو شامل ہے۔ مگر بدر کی جنگ میں یہ پہلو مکمل طور پر شامل تھا، اس لئے اس میں فرشتے اہل ایمان کی مدد کے لئے اتارے گئے۔

نظام جبر کا استیصال

دفاعی جنگ کے دوران دوسرا فائدہ جو اسلام کے دور اول میں حاصل کیا گیا وہ شرک جارح کے فتنہ کو ختم کرنا تھا۔ یہ حکم جن آیتوں میں دیا گیا ان میں سے ایک واضح آیت یہ ہے:

وقاتلوهم حتی لا تکون فتنة ویکون الدین کلّه للّٰه (الانفال ۳۹)

اور ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب کا سب اللہ کے لئے ہو جائے۔

اس حکم سے مراد یہ تھا کہ مذہبی جبر کو ختم کر دیا جائے، اور آزادئ مذہب کا دور دنیا میں لا یا جائے۔ ایک صحابی نے اسی مشن کو ایرانی حکمراں کے سامنے اخراج العباد من عبادة العباد الی عبادة اللّٰه کے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں شروع ہوا اور صحابہ کرام کے زمانہ میں وہ آخری حد تک انجام پا گیا۔

آج کا ایک حکمراں عوامی ووٹ کی دلیل سے حکومت کرتا ہے۔ قدیم زمانہ کے بادشاہ لوگوں کو یہ یقین دلا کر حکومت کرتے تھے کہ وہ خدا کا دنیوی ظہور رہیں۔ وہ خدا کے مقدس نمائندے ہیں۔ یہی قدیم زمانہ کے تمام حکمرانوں کا عام معاملہ تھا (EB-16/118)

مقدس بادشاہت (sacred kingship) یا خدائی حقوق بادشاہی

(divine right of kings) قدیم زمانہ کا عام رواج تھا۔ دنیا بھر کے تمام چھوٹے بڑے حکمراں کسی نہ کسی طور پر "خدائی بادشاہ" بنے ہوئے تھے۔ اس بنا پر قدیم زمانہ میں ہر جگہ شاہانہ آمریت (monarchical absolutism) قائم تھی۔ بادشاہ کو اپنی رعایا کے اوپر ہر قسم کا کامل اختیار حاصل تھا۔ بادشاہ مطلق طور پر یہ حق رکھتا تھا کہ وہ حکم دے، اور عوام کی یہ مطلق ذمہ داری تھی کہ وہ بے چون وچرا بادشاہ کے حکم کی اطاعت کریں (III/583)

قدیم بادشاہوں نے مطلق حکمرانی کا یہ حق مشرکانہ مذہبی عقائد کے ذریعہ حاصل کیا تھا مشرکانہ مذہب اس عقیدہ پر قائم ہے کہ خدا اگرچہ ایک ہے مگر وہ مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ قدیم بادشاہوں نے اس عقیدۂ تعدد سے فائدہ اٹھایا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ خدا کی تجسیم ہیں۔ خدا ان کی صورت میں دنیا میں ظاہر ہوا ہے۔ اس بنا پر ان کو حق ہے کہ وہ انسانوں کے اوپر مطلق حکمرانی کریں۔

یہ بادشاہ جب یہ کہتے تھے کہ "میں خدا ہوں" تو ان کا یہ دعویٰ مشرکانہ مذاہب کے مطابق ہوتا تھا۔ مگر موحدانہ مذہب اس کی تصدیق نہیں کرتا۔ کیوں کہ توحید کے عقیدہ کے مطابق خدا ہر اعتبار سے صرف ایک ہے۔ خدا کی خدائی میں کسی بھی پہلو سے کوئی شریک وسہیم نہیں۔ اس طرح مشرکانہ مذہب ان بادشاہوں کے موافق اور موحدانہ مذہب ان کے خلاف ہو جاتا تھا۔ وہ مشرکانہ مذہب کی سرپرستی کرتے تھے اور موحدانہ مذہب کو کچلنے کی کوشش کرتے تھے۔

یہی وہ سیاسی نظام ہے جس نے قدیم زمانہ میں وہ صورت حال پیدا کر رکھی تھی جس کو مذہبی جبر (religious persecution) کہا جاتا ہے۔ قدیم زمانہ کے بادشاہوں نے ہر جگہ مشرکانہ مذہب کو سرکاری مذہب بنا رکھا تھا۔ وہ اس کے نام پر بڑے بڑے معبد بناتے تھے۔ جب بھی وہ دیکھتے کہ کوئی شخص توحید کی دعوت لے کر اٹھ رہا ہے تو اس کو وہ ریاست کا غدار سمجھتے تھے اور پوری طاقت سے اس کو کچل دیتے تھے۔ یہی وہ تاریخی صورت حال ہے جس کا ذکر قرآن میں اس طرح کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کی دشمنی اس کے سوا کسی اور وجہ سے نہ تھی کہ وہ ایک اللہ پہ ایمان لے آئے (البروج ۸)

اللہ تعالیٰ کو منظور تھا کہ مذہبی جبر کی یہ صورت حال ختم ہو۔ چنانچہ قرآن میں اصحاب رسول کو یہ حکم دیا گیا کہ تم لوگ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سب اللہ کا ہو جائے (البقرہ ۱۹۳، الانفال ۳۹) ان آیتوں میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔ اصحاب رسول نے غیر معمولی قربانیوں کے ذریعہ اس مشن کی تکمیل کی۔ یہاں تک کہ عرب کے اندر اور عرب کے باہر مشرکانہ سیاست اور خدا کے نام پر ظالم حکمرانی کا دور ختم ہو گیا۔ کسی دین کو حقیقی معنوں میں دین کی حیثیت حاصل نہ رہی۔ دین کی نوعیت کی تمام چیزیں صرف اسلام کے حق میں ہو گئیں۔

صحیح البخاری، کتاب التفسیر میں سورہ البقرہ اور سورہ الانفال کے ابواب کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر کی تین روایتیں نقل کی گئی ہیں۔ یہ قرآن کی اس آیت کی بہترین تفسیر ہیں۔ فتنہ ابن الزبیر کے زمانہ میں وہ مکہ میں تھے مگر مسلمانوں کی اس باہمی جنگ میں وہ شریک نہیں ہوئے۔ مذکورہ آیت کا حوالہ دیتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ آپ اس فتنہ کو ختم کرنے کے لئے جنگ کیوں نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ اس آیت میں جس جنگ کا حکم ہے وہ ہم کر چکے (قد فعلنا علیٰ عهد رسول الله صلی الله علیه وسلم۔ اذا کان الاسلام قليلا فكان الرجل يفتن فى دينه اما يقتلوه و اما يوثقوه حتى كثر الاسلام فلم تكن فتنة) فتنہ ابن الزبیر میں ملوث لوگوں نے جب بہت اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ ہم جنگ کر چکے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہا اور دین اللہ کے لئے ہو گیا اور تم لوگ چاہتے ہو کہ جنگ کرو یہاں تک کہ دوبارہ فتنہ پیدا ہو اور دین غیر اللہ کے لئے ہو جائے (قاتلنا حتى لم تكن فتنة وكان الدين لله وانتم تريدون ان تقاتلوا حتى تكون فتنة ويكون الدين لغير الله)

یعنی اس آیت کا اصل مدعا یہ تھا کہ وہ صورت حال ختم کر دی جائے جس کے نتیجہ میں غیر ضروری طور پر خدا کا دین سیاسی حکمرانوں کا حریف بنا ہوا ہے۔ مشرکانہ سیاست کے خاتمہ سے یہ مقصد پوری طرح حاصل ہو گیا۔ مگر تم لوگ یہ نادانی کر رہے ہو کہ نئے عنوان سے دوبارہ دین الٰہی کو سیاسی حکمرانوں کا حریف بنا دینا چاہتے ہو۔ قرآنی آیت کے حوالہ سے تم قرآنی منشا کے برعکس عمل کر رہے ہو۔

قدیم زمانہ میں شرک کی بنیاد پر جو مذہبی جبر قائم تھا، اس کو ختم کرنے کے لئے اسلام

نے دو طریقہ اختیار کیا۔ ایک، ایسی حکومتوں سے لڑکر ان کو توڑ دینا، دوسرے، سیاسی نظام میں شخصی حکومت کے بجائے اس چیز کو رواج دینا جس کو موجودہ زمانہ میں جمہوری حکومت کہا جاتا ہے۔

پہلے عمل کا آغاز عرب میں ہوا۔ عرب میں قریش کا قبیلہ یہی حیثیت حاصل کئے ہوئے تھا۔ وہ خود مشرکانہ عقائد کو مانتے تھے اور انھوں نے عرب کے قبائل کے بتوں کا سرپرست بن کر پورے ملک میں اپنی سیادت قائم کر رکھی تھی۔ انھوں نے دور اول کے مسلمانوں کے ساتھ بدترین قسم کی زیادتیاں کیں۔ ان مسلمانوں کا قریش سے کوئی معاشی یا سیاسی جھگڑا نہ تھا۔ ان کا قصور صرف وہ تھا جس کی بابت رجل مومن نے فرعون سے کہا تھا کہ کیا تم ایک شخص کو صرف اس لئے قتل کر دوگے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب صرف ایک اللہ ہے (المومن ۲۸)

قریش کی جارحیت جب زیادہ بڑھ گئی تو اصحاب رسول نے ان سے جنگ کی۔ اس جنگ میں انھیں اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل ہوئی۔ آخر کار عرب کے قریش کا مشرکانہ اقتدار ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

عرب کے باہر اس زمانہ میں "سیاسی شرک" کے دو بڑے سرپرست تھے۔ ایک بازنطینی امپائر اور دوسرے ساسانی امپائر۔ ان دونوں شہنشاہیتوں نے بہت بڑے پیمانہ پر مذہبی جبر قائم کر رکھا تھا۔ اسی بنا پر جب ان کے پڑوس عرب میں توحید کی دعوت اٹھی تو دونوں حکومتیں اس کی دشمن بن گئیں۔ کیوں کہ توحید کے عقیدہ کا فروغ ان کی مشرکانہ عقائد پر مبنی سیاست کی تردید تھا۔

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں حکمرانوں کو توحید کی دعوت دی۔ دونوں نے آپ کے پیغام کی تحقیر کی۔ حتیٰ کہ انھوں نے خود آپ کے خلاف جارحیت کا آغاز کیا۔ اس کے نتیجہ میں ان کے ساتھ اہل اسلام کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ اپنی ظاہری نوعیت کے اعتبار سے دفاعی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے دوبارہ اس میں نہایت اعلیٰ مقصدی پہلو شامل کر دیا۔ اور اہل اسلام کی خصوصی مدد فرمائی۔ چنانچہ غیر متناسب مقابلہ کے باوجود بہت کم مدت میں وہ دونوں نظاموں کو توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔

اسلام کی تاریخ میں ہر جنگ کے اسباب فریق مخالف نے پیدا کئے۔ جب جنگ چھڑ گئی تو اسلام نے ہر بار اس کو مثبت مقصد کے لئے استعمال کیا۔

جمہوری دور

موجودہ زمانہ میں ڈیموکریسی کے مورخین عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ ڈیموکریسی کا آغاز یونان کی شہری ریاستوں (city-states) سے ہوا۔ مگر متعدد وجوہ سے یہ بیان درست نہیں۔ یہ نام نہاد شہری ریاست حضرت مسیح سے تقریباً پانچ سال پہلے صرف مختصر مدت کے لئے یونان میں قائم ہوئی۔ اس میں اور جدید ڈیموکریسی کے ظہور میں دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ نیز یہ کہ یہ حقیقتہً یونان کے خواص کا ایک سیاسی نظام تھا۔ اس میں عوام کا حصہ بہت کم ہوتا تھا (III/458)

تاریخ بتاتی ہے کہ غلاموں کا طبقہ اور بہت سے عوام اس سیاسی ڈھانچہ میں شامل نہیں کئے گئے تھے۔ ایتھنز کی شہری ریاست، اپنی آخری کامل صورت میں جو اس کو چوتھی صدی قبل مسیح میں حاصل ہوئی، زیادہ تر محدود اقلیت کی ڈیموکریسی تھی۔ وہ یونان کے امراء کی ڈیموکریسی تھی جو کل آبادی کا دس فیصد حصہ تھے۔ ایتھنز کا کلچر بدستور امراء کا کلچر بنا ہوا تھا:

Athenian culture continued to be oriented toward the noble life. (6/323)

حقیقت یہ ہے کہ ڈیموکریسی حقیقی معنوں میں، تاریخ میں پہلی بار اسلام نے قائم کیا۔ اسلام جمہوری دور کا خالق ہے۔ اسلام سے پہلے تمام معلوم تاریخ میں بادشاہت کا نظام رائج تھا۔ اسلام نے تاریخ میں پہلی بار جمہوری دور کا آغاز کیا۔ موجودہ زمانہ میں جس چیز کو جمہوری نظام کہا جاتا ہے اس کو قرآن میں شورائی نظام کہا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، اس کے بعد خلفاء راشدین کے زمانہ میں اور پھر عمر بن عبد العزیز کے زمانہ میں شورائی (یا جمہوری) نظام اپنی کامل صورت میں قائم رہا۔ اس کے بعد اگرچہ اس میں کمیاں پیدا ہوئیں۔ مگر نظام فکر کی حیثیت سے صد فی صد اور عملی ڈھانچہ کی حیثیت سے پچاس فیصد وہ تاریخ میں جاری رہا۔ موجودہ زمانہ کی مغربی جمہوریت اسی کے زیر اثر ظہور میں آئی ہے۔

سیاست میں غیر شخصی نظام لانے کے لئے قرآن میں یہ اصولی حکم دیا گیا کہ ان کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے (وامرھم شوریٰ بینھم، الشوریٰ ۳۸) اس کے مطابق، اجتماعی معاملات میں صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ محض ذاتی رائے کی بنیاد پر ایک فیصلہ کیا جائے اور اس کے مطابق سب

کے اوپر احکام نافذ کئے جانے لگیں۔ اجتماعی معاملات میں صحیح طریقہ مشورہ کا طریقہ ہے۔ یعنی تمام لوگوں سے براہ راست یا بالواسطہ طور پر مشورہ لینا اور پھر اس کی روشنی میں معاملات کو چلانا۔

دور اول میں اسلامی تحریک جب فکری مرحلہ سے گزر کر اقتدار کے مرحلہ میں پہنچی تو اسی مشاورتی اصول پر سیاست و حکومت کا پورا نظام قائم کیا گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس کا اتنا زیادہ اہتمام فرمایا کہ قرائن کے مطابق اگرچہ آپ یہ چاہتے تھے کہ آپ کے بعد "امیر المومنین" کا عہدہ حضرت ابوبکر صدیق کو دیا جائے۔ مگر آپ نے کبھی ان کو نامزد نہیں فرمایا۔ ذاتی خواہش کے باوجود اس معاملہ کو آپ نے عام مسلمانوں پر چھوڑ دیا۔ چنانچہ آپ کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں آپ کے ہاتھ پر امارت کی بیعت ہوئی۔ اور عام مسلمانوں کی رائے سے آپ اسلامی حکومت کے ذمہ دار قرار پائے۔

آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین عوام کی رائے ہی سے خلیفہ مقرر ہوئے۔ حضرت عمر فاروق کو ان کے پیش رو حضرت ابوبکر صدیق نے نام زد فرمایا تھا۔ مگر خلیفہ اول کی وفات کے بعد عامۃ المسلین نے اس کی تصدیق کی اس کے بعد وہ باضابطہ امیر المومنین قرار پائے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کو جب ان کے پیش رو خلیفہ کی تحریری وصیت کے مطابق خلیفہ بنایا گیا تو انھوں نے دمشق کی جامع مسجد میں لوگوں کو جمع کیا اور اعلان کیا کہ اے لوگو، میری رائے کے خلاف اور مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر مجھ کو خلیفہ بنا دیا گیا ہے۔ تمہاری گردن میں میری بیعت کا جو قلادہ ہے اس سے میں تم کو آزاد کرتا ہوں۔ تم اپنے اندر سے جس شخص کو چاہو اس عہدہ کے لئے چن لو۔ لوگوں نے بیک آواز چیخ کر کہا کہ اے امیر المومنین، ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔ ہم آپ کے اوپر راضی ہیں:

ایھا الناس، انی قد ابتلیت بھذا الامر عن غیر رأی کان منی فیہ ولا طلبۃ لہ ولا مشورۃ من المسلمین۔ و انی قد خلعت ما فی اعناقکم من بیعتی فاختاروا لانفسکم فصاح الناس صیحۃ واحدۃ۔ قد اخترناک یا امیر المومنین۔ و رضینا بک۔

(سیرۃ ومناقب عمر بن عبد العزیز الخلیفۃ الزاھد، لابن الجوزی، صفحہ ۶۵)

وہ سماجی برائیاں جن کے پیچھے ہزاروں برس کی روایات شامل تھیں ان کو یکبارگی ختم کرنا ممکن نہ تھا۔ اسلام نے ان کو تدریجی طور پر ختم کیا۔ اسلامی انقلاب نے ان چیزوں میں ایک اصلاحی عمل جاری

کیا۔ یہاں تک کہ اس عمل کی تکمیل پر آخر کار وہ برائی ختم ہوگئی۔ اس کی ایک مثال انسانوں کو غلام بنانے کا رواج ہے۔ اس معاملہ میں یہی ہوا کہ اسلام نے تاریخ میں ایک عمل جاری کر دیا جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ بعد غلامی کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ اجتماعی خرابیوں کی اصلاح کے لئے تدریجی طریقہ ہی درست ہے۔ تدریجی طریقہ سے برائی آخر کار ختم ہوجاتی ہے۔ نام نہاد انقلابی طریق کار سے ایک برائی ختم ہوکر دوسری شدید تر برائی پیدا ہوجاتی ہے۔

شخصی نوعیت کی مطلق حکمرانی کے معاملہ میں بھی یہی پیش آیا۔ اس برائی کو اچانک پوری طرح مٹا دینا ممکن نہیں تھا۔ اسلام نے اس کے خلاف فکری انقلاب برپا کیا۔ اس کے حق میں مشاورتی نظام حکمرانی کی نہایت اعلیٰ مثال قائم کی۔ اس کے بعد تاریخ میں اس کا عمل جاری ہوگیا۔ بعد کے زمانہ میں اگرچہ مسلم سلاطین کے یہاں خاندانی حکومت کا رواج شروع ہوگیا۔ مگر ابتدائی اسلامی انقلاب کے اثرات اتنے طاقت ور تھے کہ مسلم سلاطین دوبارہ کبھی مطلق شہنشاہیت کا طریقہ اختیار نہ کرسکے۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں "اسلام" کے مقالہ کے تحت اعتراف کیا گیا ہے کہ بنو امیہ کے بعد اگرچہ مسلم سلاطین کے یہاں شوریٰ کا سابقہ نظام باقی نہ رہا۔ مگر اس تبدیلی کے باوجود، مسلم حکمراں کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ مطلق حکمراں بن جائے۔ کیوں کہ شرعی قانون نے اس کے اوپر ایک اساسی پابندی عائد کر رکھی تھی، جس کے تحت وہ حکومت کا حق حاصل کرتا تھا اور جس کی تنفیذ اور جس کے دفاع کا وہ پوری طرح پابند تھا:

In spite of this development, the ruler could not become absolute because a basic restraint was placed upon him by the Shariah law under which he held his authority and which he dutifully was bound to execute and defend. (9/921)

اس طرح اسلام کا "شورائی انقلاب" تاریخ میں جاری ہوگیا۔ وہ ایشیا سے افریقہ، افریقہ سے یورپ، یورپ سے امریکہ کی طرف سفر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اس سیاسی انقلاب تک پہنچ گیا جس کو موجودہ زمانہ میں جمہوریت (ڈیموکریسی) کہا جاتا ہے۔

عبداللہ یوسف علی نے اپنی کتاب (Religous polity of Islam) میں بجا طور پر

لکھا ہے کہ جدید دنیا کی نمائندہ حکومت (representative government) اسلام کے شوریٰ کے اصول کو اسٹیٹ کے معاملات میں منطبق کرنے کی ایک کوشش ہے۔

جدید مغرب میں جو نمائندہ جمہوریت (representative democracy) آئی ہے اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسی سیاسی عمل کی تکمیل ہے جو اسلام نے چودہ سو سال پہلے عرب میں شروع کیا تھا۔ اس کا ماخذ یونان کی شہری ریاست (city-state) نہیں ہوسکتی جس کے اور یورپی جمہوریت کے درمیان دو ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ مورخین نے اعتراف کیا ہے کہ مغرب کے جمہوری نظام کا ماخذ قرون وسطیٰ کے افکار (medieval ideas) ہیں (III/458)

یہ خیالات و افکار یورپی مفکرین کو مسلم لٹریچر کے یورپی زبانوں میں ترجمہ کے ذریعہ پہنچے۔ ان کے مطالعہ سے یورپی علما کو فکری رہنمائی ملی۔ انھوں نے اس راستہ پر چل کر وہ سیاسی تحریکیں برپا کیں جنھوں نے آخر کار یورپ سے بادشاہت کو ختم کیا اور جمہوری دور کا آغاز کیا۔

فرانس کا روسو جو جمہوری انقلاب کے بانیوں میں سمجھا جاتا ہے، اس کی کتاب معاہدۂ عمرانی (Du contract social) ۱۷۶۲ میں چھپی۔ اس کتاب کا یہ جملہ بہت مشہور ہے کہ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر ہر جگہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا نظر آتا ہے"۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ روسو کا یہ جملہ خلیفہ ثانی عمر فاروق کے جملہ کی صدائے بازگشت ہے جو انھوں نے روسو سے گیارہ سو سال پہلے مدینہ میں کہا تھا۔ انھوں نے حاکم مصر عمرو بن العاص کے بیٹے پر جمہوری برابری کا عملی نفاذ کرتے ہوئے فرمایا تھا: اے عمرو، تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد پیدا کیا تھا۔

حقوق انسانی کا عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) جو ۱۹۴۸ میں تمام قوموں کے دستخط سے جاری ہوا، اس کے آرٹیکل ۱۸ میں اعلان کیا گیا ہے کہ ہر شخص خیال اور ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق رکھتا ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدہ کو بدلنے کا حق بھی شامل ہے، اس میں یہ حق بھی شامل ہے کہ کوئی شخص اپنے مذہب کا اظہار کرے یا اس کی تعلیم دے یا اس پر عمل کرے یا اس کے مطابق عبادت کرے، خواہ تنہا یا جماعت کے ساتھ، عوامی طور پر یا ذاتی طور پر:

Everyone has the right to freedom of thought, conscience and religion; this right includes freedom to change his religion or belief, and freedom, either alone or in community with others and in public or private, to manifest his religion or belief in teaching, practice, worship and observance. (X/1050).

یہ اعلان آج بظاہر سادہ سا معلوم ہوتا ہے۔ مگر پچھلے ہزاروں سال تک یہ سادہ حق اہل مذاہب کو حاصل نہ تھا۔ مذہب کی بے ضرر تبلیغ بھی نہ صرف ممنوع تھی بلکہ وہ ریاست کے خلاف غداری کے ہم معنی تھی۔ چنانچہ پچھلے تمام زمانوں میں مذہبی تشدد (religious persecution) تمام قوموں اور ملکوں میں عام رہا ہے (VII/583)

اس عمومی مذہبی تشدد کو نافذ کرنے والے زیادہ تر مشرک حکمراں تھے۔ اس بنا پر توحید کی دعوت کا کام ساری دنیا میں مشکل ترین کام بن گیا تھا۔ اسی حقیقت کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قدیم زمانہ میں کسی کو یہ کہنے کی اجازت نہیں تھی کہ اللہ ایک ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا اعلان کرتا تو اس کو سخت عذاب دیا جاتا۔ حتی کہ ایک شخص کو زمین میں گاڑ کر کھڑا کیا جاتا اور اس کے سر پر آرہ چلا دیا جاتا جس کے نتیجہ میں اس کے جسم کا آدھا حصہ ایک طرف گر جاتا اور آدھا حصہ دوسری طرف۔

اسلامی انقلاب کے بعد جب شاہانہ جبر کا خاتمہ ہوا تو دنیا میں آزادی کی لہر چل پڑی۔ یہ لہر مکہ، مدینہ، دمشق، بغداد، اسپین اور سسلی ہوتی ہوئی یورپ میں داخل ہوگئی۔ یہاں تک کہ آزادی ایک مسلّمہ انسانی حق کی حیثیت سے تسلیم کرلی گئی۔ اب ہر شخص کو فکر و خیال کی مکمل آزادی ہے۔ ہر شخص کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے اختیار کرے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے۔

آزادی کا یہ انقلاب مسلمانوں کی آزادی کے طور پر نہیں آیا بلکہ تمام انسانوں کی آزادی کے طور پر آیا ہے۔ ایسی حالت میں قدرتی بات ہے کہ ہر ایک اس کو استعمال کرے گا۔ اس بنا پر بولنے والے اسلام کے خلاف بھی بولیں گے۔ وہ باطل عقائد کا پرچار کریں گے۔ مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس آزادی نے دین توحید کو تاریخ میں پہلی بار کامل آزادی دے دی ہے۔ اس نے اہل

توحید کو یہ کھلا حق دے دیا ہے کہ وہ آزادانہ طور پر دین توحید کا اعلان کریں اور کسی رکاوٹ کے بغیر اس کا پیغام سارے عالم میں ہر جگہ پہنچا دیں۔

اگر کچھ لوگ آزادی کا غلط استعمال کرکے خلاف حق نظریات کی تبلیغ کریں تو اس سے اہل حق کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اہل حق کا اہل حق ہونا اور فریق ثانی کا اہل باطل ہونا ہی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ فریق ثانی آخر کار مٹ جائے اور اہل حق کو غلبہ اور سربلندی حاصل ہو۔

اہل حق کے لئے درست نہیں کہ وہ اہل باطل کی زبان بندی کا مطالبہ لے کر کھڑے ہوں۔ امتحان کی اس دنیا میں اس قسم کا مطالبہ ایک ناقابل حصول مطالبہ ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اہل حق اپنے موقف کی صداقت پر اعتماد کریں۔ وہ اس یقین پر کھڑے ہوں کہ اس دنیا میں باطل ہمیشہ بے زمین رہے گا۔ اس کو دلائل وحقائق کی طاقت کبھی نہیں مل سکتی۔ دلائل وحقائق کا زور ہمیشہ حق کو حاصل رہے گا۔ ماضی اور حال کے واقعات اس اصول کی صداقت پر گواہ ہیں۔

اہل حق کو منفی راستوں میں اپنی طاقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ انھیں صرف یہ کرنا چاہئے کہ مثبت طور پر حق کے پیغام کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ حق کی پشت پر ان تمام دلائل کو جمع کریں جو فطرت کی دنیا میں اس کے لئے رکھے گئے ہیں۔ یہی صحیح راستہ ہے اور اسی میں ان کی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے۔

باب سوم

کیا تمام مذاہب ایک ہیں

ایک مسافر دہلی کے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہو، اور "پوچھ تاچھ" کی کھڑکی پر یہ دریافت کرے کہ میں بمبئی جانا چاہتا ہوں۔ بتائیے کہ مجھے کس ٹرین سے جانا چاہئے۔ اس کے جواب میں اگر متعلقہ شخص یہ کہے کہ تمہارے سامنے ایک درجن پلیٹ فارم پر جو ٹرینیں آتی جاتی نظر آرہی ہیں ان میں سے جس ٹرین پر بھی تم بیٹھ جاؤگے وہ تم کو بمبئی پہنچا دے گی، تو اگلے لمحہ وہ مسافر شاید کمپلینٹ بک کا مطالبہ کرے گا تاکہ محکمۂ ریلوے کو اس شخص کے پاگل ہونے کی اطلاع دے۔ مگر یہی نامعقول بات جب مذہب کے بارے میں کہی جاتی ہے تو اس پر تحسین و آفریں کے نعرے بلند کئے جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے ناشرین ان خیالات کو چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ دنیا کے راستوں کا ہر مسافر جانتا ہے کہ دہلی سے بمبئی جانے والی ٹرین کوئی مخصوص ٹرین ہی ہو سکتی ہے۔ ہر وہ چلتی ہوئی سواری جس کا نام ٹرین ہو وہ آدمی کو بمبئی نہیں پہنچا دے گی۔ مگر حق کا سفر اس سے مستثنیٰ ہے۔ آدمی جس بھیڑ کے ساتھ بھی چل پڑے وہ لازماً حق کی منزل تک پہنچ جائے گا۔

وحدتِ ادیان کے مبلّغین

جو لوگ اس قسم کا نظریہ پیش کرتے ہیں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس میں ہر فرقہ کے لوگ شامل ہیں۔ ان میں سے چند کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں:

"میرا ہندو رجحان مجھے بتاتا ہے کہ تمام مذاہب کم یا زیادہ صداقت پر مبنی ہیں۔ مختلف مذاہب دراصل مختلف راستے ہیں جو ایک ہی مرکزی نقطے کی طرف جا رہے ہیں۔"

My Religion, p.19

سی راج گوپال آچاریہ کے نزدیک یہ ایک حقیقت (Truth) ہے کہ تمام بڑے مذاہب ایک ہیں اور ان کے نام یا ان کے عبادتی طریقوں کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

Essential Unity of All Religions, p. XCI

ڈاکٹر رادھاکرشنن تحریر فرماتے ہیں کہ ہندوازم کے نزدیک "آخری حقیقت (Supreme reality) کو جاننے اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہوسکتے ہیں، جب کہ دوسرے نظریات" یہ خیال رکھتے

ہیں کہ خدا کے بارے میں بنیادی صداقت صرف انھیں کے پاس ہے۔" اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

" اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا یہ حق ہے کہ دوسرے مذاہب کا استخفاف کرکے ہم بذریعہ طاقت اپنے مذہب کو پھیلائیں تو ہم اخلاقی تضاد کے مجرم ہیں۔ کیوں کہ زبردستی، بے انصافی اور ظلم، روحانیت اور تہذیب کی عین ضد ہیں۔ ہندوازم اس قسم کا کوئی لگا بندھا عقیدہ ((Fixed creed)) نہیں ہے۔ ایک ہندو کے نزدیک ہر مذہب سچا ہے۔ بشرطیکہ اس کے ماننے والے سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ اس کی پیروی کریں۔

Religion and Society, p. 53

ہندستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اختلاف میں اتحاد (Unity/diversity) کو ہندستان کی خصوصیت قرار دیا ہے اور دوسروں کے لئے بھی ایک بہترین اصول کے طور پر اس کو قابل تقلید بتاتا ہے۔

The Times of India, December 16, 1960

ڈاکٹر سی پی راما سوامی آئر لکھتے ہیں:

" دنیا مذہب اور زندگی کے ہندو نقطۂ نظر سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ ہندو کا فلسفۂ مذہب ایک تجرباتی بنیاد سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا انحصار ایک خاص قسم کی روحانی زندگی یا تجربے کو قبول کرنے پر نہیں ہے۔ یہ وسیع معنوں میں روادار ہے اور اپنے سوا نقطۂ نظر کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ ہر عقیدہ اور ہر نظام جو آدمی کی روح کو اوپر اٹھائے وہ صحیح مانا جائے گا۔ یہ ایک متعین اور جامد عقیدہ نہیں ہے بلکہ یکساں قسم کے روحانی خیالات اور طریقوں کا مجموعہ ہے۔ بہت سے فرقے مختلف عقیدوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔ اس کو اس سے بحث نہیں کہ طالب حق نے اپنا سچائی تک پہنچنے کا خواب مندر کے سایہ میں دیکھا ہے یا چرچ اور مسجد کی عبادت گاہ میں۔

Fundamentals of Hindu Faith and Culture, pp.30-31

ڈاکٹر راجندر پرشاد کسی ایک مذہب کی صحت پر اصرار کرنے کو مذہبی جنون (Religious fanaticism) قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"سچائی ایک ہے اگرچہ حکما اس کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں"۔ یہ قدیم بزرگوں کے زمانے سے ہمارا اصول رہا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ یقین کرتے رہے ہیں کہ آخری منزل (Supreme goal) تک مختلف راستوں سے پہنچا جا سکتا ہے اور آدمی منزل تک پہنچنے کے لئے جو راستہ بھی اختیار کرے گا اس سے وہ منزل تک پہنچ جائے گا۔ اس لئے کسی کو بھی دوسرے سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ سب کے سب ایک ہی منتہا کی طرف سفر کر رہے ہیں اگرچہ ان کی راہیں مختلف ہیں۔ سناتن دھرم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ سچائی تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے یا یہ کہ وہی ایک صحیح راستہ ہے اور دوسرے تمام راستے غلط اور گمراہ کن ہیں۔ اس لئے اس ملک میں کبھی یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ ایک شخص نے اپنے لئے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کو وہ دوسروں پر لادنے کی کوشش کرے۔ اسی وجہ سے مختلف فرقوں اور مختلف مذہبی اعتقاد رکھنے والوں کے لئے یہ ممکن ہو سکا ہے کہ وہ اس ملک میں ساتھ ساتھ رہ سکیں۔ اور ان کے باہمی معاملات میں کوئی اجنبیت اور فساد پیدا نہ ہو۔ اس کے برعکس بہت سے مذاہب کا ایک خاص عقیدہ یہ بھی ہے کہ سب لوگوں کے لئے سچائی تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور جو شخص بھی اس کو نہیں مانے گا یا اس پر نہیں چلے گا وہ کبھی بھی انسانیت کی اعلیٰ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک بدیہی نتیجہ جو فطری طور پر اس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر میرا راستہ ہی ایک صحیح راستہ ہے اور دوسرے تمام راستے گمراہ کن ہیں تو یہ میری ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر لانے کی کوشش کروں اور اس طرح دوسروں کے مذہب کو بدلنا ایک مقدس فریضہ اور متبرک عمل قرار پاتا ہے"۔

Book University Journal, July 3, 1955, pp. 19-20

یہ تصور ہندستان کا بہت پرانا تصور ہے۔ چنانچہ یہاں کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں یہ نظریہ موجود ہے۔ اشوک نے اپنے زمانہ میں پتھر کے ستونوں پر جو فرامین کندہ کر کے جابجا نصب کرائے تھے ان میں سے بارھواں فرمان یہ تھا:

"جو شخص اپنے مذہب کی تعظیم کرے اور جوشِ عقیدت میں اسے اور سب مذاہب پر فوقیت دینے کے لئے دوسرے کے مذہب کی تحقیر کرے وہ یقیناً خود اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ درحقیقت جو چیز پسندیدہ ہے وہ مذاہب کی ہم آہنگی ہے"۔

وحدتِ ادیان پر تبصرہ

اب اس عقیدے کا تجزیہ کیجیے۔ "تمام مذاہب سچے ہیں" کا مطلب کیا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ سب کا سب حقیقت ہے۔ اگر تمام مذاہب کے برحق ہونے کا مطلب یہ ہو تو یہ اتنی غیر عقلی بات ہے جس پر کسی طرح یقین نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مختلف مذاہب کی تعلیمات میں کافی اختلاف ہے۔ مثلاً اسلام اور ہندو دھرم کو لیجیے۔ ہندو تعلیمات کے مطابق خدا یا خدائی اختیارات رکھنے والی ہستیاں بہت سی ہیں۔ جبکہ اسلام کے نزدیک یہ ہستی صرف ایک ہے۔ اسی طرح عبادات اور اعمال میں دونوں مذاہب کے طریقے بالکل جدا ہیں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور زندگی کا آخری انجام کیا ہے۔ اس کے متعلق بھی دونوں مذاہب کے جوابات بالکل مختلف ہیں۔ اسلامی تصور کے مطابق انسانوں کے پاس خدا کا پیغام، رسولوں کی معرفت بذریعہ وحی آتا ہے۔ اس کے برعکس ہندو نظریہ یہ ہے کہ جب دنیا میں بگاڑ ہوتا ہے تو خود "بھگوان انسانی شکل میں اوتار[1] لیتے ہیں" اس طرح کے بے شمار اختلافات ہیں جو دونوں مذاہب کے فلسفہ اور عمل میں پائے جاتے ہیں۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہوگی کہ ان میں سے ہر ایک کو صحیح مان لیا جائے۔

مذہبی وحدت کی بات کس قدر بے معنی ہے، ایک مثال سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ مہاتما گاندھی نے گائے کے متعلق لکھا ہے:

"گائے کی حفاظت ایک ہندو کی محبوب ترین چیز ہے۔ جو شخص گائے کے تحفظ میں یقین نہیں رکھتا وہ ہرگز ہندو نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک عظیم عقیدہ ہے۔ میرے نزدیک گائے کی پوجا کے معنی ہیں، معصومیت کی پوجا، گائے کی پوجا کمزور اور بے سہارا کی پوجا کا نام ہے۔

My Religion, p. 154

دوسری طرف اسلام کے نزدیک گائے اس لئے ہے کہ وہ انسان کے لئے خوراک اور دوسری ضروری چیزیں فراہم کرے۔ وہ اس کو ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اس کے گوشت کو انسان کے لئے پاک غذا بتاتا ہے۔ اگر مہاتما گاندھی کے تجزیے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندو دھرم

---

[1] اوتار کے معنی ہیں "غیر ظاہر صورت سے ظاہر صورت میں ظہور پذیر ہونا"

رحم کا مذہب ہے اور اسلام خوں خواری کا۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں نظریے صحیح ہوں۔ کیا ایک لمحے کے لئے بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک خدا نے دو بالکل مختلف قسم کے احکام دیے ہیں۔

۲۔ پھر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے ان کا جوہر نکالا جائے اور ایک متفقہ مذہب پیدا کیا جائے۔ یہ اور زیادہ بے معنی بات ہے۔ درحقیقت اس قسم کا خلاصہ تیار کرنا بالکل ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ مختلف مذاہب کے درمیان بے شمار اختلافات ہیں۔ ان کا متفقہ خلاصہ تیار کرنے کی صورت یقیناً یہی ہوگی کہ ہر مذہب کی چند ایسی باتیں جو دوسرے مذاہب سے ٹکراتی نہ ہوں لے لی جائیں اور بقیہ تمام باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اس ردّ و اختیار کا فیصلہ کرنے کا کسی کو کیا حق ہے۔ وہ کون شخص ہے جو اپنے بارے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو اس قسم کی کاٹ چھانٹ کا مجاز قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی سرپھرا اس قسم کا خلاصہ تیار بھی کر ڈالے تو اس کی قیمت ایک شخص کی ذہنی اپج سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی کوشش کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ہندستان اور چین کی پالیسی میں بعض یکساں قسم کے اصول دریافت کئے جائیں اور یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ دونوں ملکوں میں ایک ہی قانون کی حکومت ہے۔ اور یہاں کی عدالتیں دونوں میں سے جس قانون کے مطابق بھی فیصلہ کر دیں وہ صحیح مانا جائے گا۔ بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس جو راد ھاکرشنن کے الفاظ میں "مختلف مذاہب کے متعلق انسائیکلو پیڈیائی معلومات رکھتے ہیں" انھوں نے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ایک کتاب تیار کی ہے جس کا نام ہے :

(Essential Unity of All Religions)

اس کتاب میں انھوں نے اسی قسم کا ایک مذہب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا نام عالمی مذہب (Universal religion) یا حکیمانہ مذہب (Scientific religion) رکھا ہے (ملاحظہ ہو کتاب کا پہلا باب)، مگر تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اس قسم کی کوشش کی گئی ہے اس نے مذہب کے نام سے دنیا میں ایک نئے نظریے کا اضافہ تو ضرور کیا ہے مگر وہ مختلف مذاہب کو یکجا کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذاہب کے درمیان اختلافات اتنے زیادہ اور اتنے بنیادی ہیں کہ جو شخص بھی اس قسم کا "خلاصہ" تیار کرنے اٹھے گا وہ بہت جلد

محسوس کرے گا کہ حقیقی معنوں میں مشترک اجزا کی تلاش کچھ زیادہ مفید نہیں ہے۔ اس لئے وہ مذاہب کی اصل تعلیمات کو غلط مفہوم دے کر اپنی فہرست کو مکمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بھگوان داس کی مندرجہ بالا کتاب کی مثال دی جا سکتی ہے جو اس قسم کی بے شمار غلطیوں سے بھری ہوئی ہے۔ مثلاً ایک مقام پر انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان "بقائے باہم" کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ یہی تمام مذاہب کی اصل روح ہے۔ جو لوگ مذاہب کے درمیان اس قسم کی موافقت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کی حیثیت ان کے نزدیک "ریفارمر" کی ہے (صفحہ ۸۷) فرماتے ہیں :

"تمام مذاہب یکساں قسم کی سچائیوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ مذاہب کے داعی اس پر بالکل متفق ہیں۔ اس مسئلے پر ہمیں ان کی واضح یقین دہانی حاصل ہے۔"

Essential Unity of All Religions, p.75

اس کے بعد مختلف مذاہب کے اقتباسات پیش کر کے اپنے دعوے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اسلام کی تعلیم بھی ان کے نزدیک یہی ہے کہ "بنیادی باتیں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ سچائی ایک عالمگیر چیز ہے۔ وہ کسی نسل یا مذہب کے داعی کی اجارہ داری نہیں ہے" (صفحہ ۸۲) اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قرآن کی چار آیتیں پیش کی ہیں اور ہر ایک کا بالکل غلط مفہوم بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک آیت یہ ہے:

واعتصموا بحبل الله جميعاً و لا تفرقوا (آل عمران)

اس آیت کا ترجمہ انھوں نے جن الفاظ میں کیا ہے وہ یہ ہے :

Cling, all to the strong rope of Love Divine - Love for each other, and of the One God - and do not think of separation ever. (p. 83)

یعنی سب کے سب خدائی محبت کی رسی سے چمٹ جاؤ، ایسی محبت جو ایک دوسرے کے لئے ہو اور ایک خدا کے لئے ہو، اور علیحدگی کی بات کبھی نہ سوچو۔

اگر آپ آیت کو اس کے اصل مقام میں رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جس کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اسے استعمال کیا ہے :

یہ سورہ آل عمران کی آیت ہے۔ آیت کے سیاق و سباق اور صحیح روایات کے مطابق یہاں

حبل اللہ سے مراد "قرآن" ہے۔ یہاں دراصل یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تمام لوگ، خواہ وہ کسی سابقہ کتاب الٰہی کے حامل ہوں یا اس کے بغیر ہوں، ان کو چاہئے کہ ادھر ادھر منتشر رہنے کے بجائے خدا کی اس رسی کو مضبوط پکڑ لیں جس کو خدا کا آخری رسول لے کر آیا ہے۔ مگر حبل اللہ کو "محبت" سے تعبیر کر کے آیت کے مفہوم کو بالکل الٹ دیا گیا۔ اب اس آیت کا مطلب یہ ہو گیا کہ ہر شخص اپنے طور پر جس چیز کو حق سمجھتا ہے، محبت انسانی کا تقاضا ہے کہ اس کو ایسا سمجھنے دیا جائے۔ ہر آدمی اپنے اپنے پسندیدہ دین پر قائم رہتے ہوئے محبت کے فرضی دیوتا کے گرد جمع ہو جائے۔ قرآن کے گرد سب کو اکٹھا ہونے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر صاحب مذاہب کی انسائیکلوپیڈیا ہیں مگر حیرت ہے کہ اپنا یہ نظریہ انھوں نے قرآن کی اس سورہ سے اخذ کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام اور جو لوگ اس سے اختلاف کر رہے ہیں وہ خواہ کسی سابق کتاب الٰہی کے حامل کیوں نہ ہوں، وہ کفر اور بغاوت کے مجرم ہیں۔ (آل عمران ۱۸) جس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اسلام اختیار کرے وہی ہدایت یاب ہے (۱۹) جس میں کہا گیا ہے کہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے انکار کفر یعنی خدا کی وفاداری سے انکار کرنا ہے (۳۱) جس میں کہا گیا ہے کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین خدا کے یہاں مقبول نہیں ہے۔ جو شخص کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا وہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں ناکام و نامراد ہوگا (۸۴) جس میں کہا گیا ہے کہ وہ قومیں جن پر پہلے کوئی آسمانی کتاب نازل ہوئی تھی ان کے لئے بھی اب صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ آخری رسول پر ایمان لائیں۔ ان میں سے جو ایسا کرے گا وہی دراصل خدا کا وفادار ہے اور جو ایسا نہ کرے وہ خدا کا نافرمان ہے۔ (۱۰۹) مگر ان واضح تصریحات کے باوجود ایک بالکل مختلف بات اسلام کی طرف منسوب کر دی گئی کیوں کہ اس کے بغیر "عالمی مذہب" کی اہمیت ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔

۳ پھر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اور گروہ مذہب کے نام سے جو کچھ پیش کر دے اس کو حقیقت مان لیا جائے۔ مگر یہ بدترین قسم کی موقع پرستی ہوگی۔ یہ حق کو ناحق کے ساتھ گڈمڈ کر دینا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص خدا کا انکار کرے اس کو بھی ہم صحیح مانیں اور جو شخص خدا کا اقرار کرے اس کو بھی صحیح تسلیم کریں۔ جو کہے کہ کائنات میں صرف خدا ہی کو تصرف کا اختیار ہے وہ بھی صحیح اور جو کہے کہ خدا کے سوا کچھ اور دیوی دیوتا ہیں جن کو خوش کر کے کام نکالا جا سکتا ہے وہ

بھی صحیح۔ جو کہے کہ مرنے کے بعد ایک اور دنیا میں جانا ہے جہاں جنت اور دوزخ ہے وہ بھی صحیح، اور جو کہے کہ مرکر انسان دوبارہ اسی دنیا میں جنم پاتا ہے وہ بھی صحیح۔ جو کہے کہ خدا کی بندگی کی ضرورت صرف عبادت گاہوں کے اندر ہے وہ بھی صحیح، اور جو کہے کہ عبادت گاہ سے لے کر عدالت اور پارلیمنٹ تک ہر جگہ خدا ہی کے احکام کی پیروی ہونی چاہئے وہ بھی صحیح۔ جو کہے کہ خدا اس کائنات کا صرف محرک اول ہے وہ بھی صحیح اور جو کہے کہ خدا آج بھی ہمارا خدا ہے اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے وہ بھی صحیح۔ جو خدا کو انسان کی عجوبہ پسندی کی تخلیق سمجھے وہ بھی صحیح، اور جو خدا کو ایک وجود حقیقی قرار دے وہ بھی صحیح۔ جو خدا کی مکمل فرماں برداری میں انسان کی کامیابی سمجھے وہ بھی صحیح اور جو خدا کی فرماں برداری کے بغیر کامیابی کی توقع رکھے وہ بھی صحیح۔

اس نظریے کے مطابق حق ناحق میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بھی صحیح ہے اور غلط بھی صحیح۔ مثلاً ہندستان میں سیکولر حکومت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قانون سازی اور اس کی تمام کارروائی مذہب یا خدائی ہدایت سے آزاد ہو کر انجام دی جائے گی۔ یہاں انسانی آراء کے تحت فیصلہ ہوگا نہ کہ خدائی حکم کے تحت۔ یہ اصول صریح طور پر مذہب کے اس اصول سے ٹکراتا ہے کہ "انسان کو اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں خدا کے حکم کا پابند ہونا چاہئے۔" مگر وحدتِ حقیقت کا نظریہ ایسے کسی ٹکراؤ کو تسلیم نہیں کرتا۔ نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن اس تضاد کی توجیہہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شاید لوگوں کو تعجب ہو کہ ہماری تہذیب کی جڑیں تو روحانی قدروں میں پیوست ہیں لیکن ہماری حکومت غیر مذہبی ہے۔ دراصل غیر مذہبی ہونے سے مراد لا مذہبیت یا دہریت یا مادی راحت کو اہم سمجھنا نہیں بلکہ اس بات کا اعلان کرنا اور اس پر زور دینا ہے کہ روحانی قدریں عالمگیر ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔" (قومی تہذیب کا مسئلہ، صفحہ ب)

اس مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ مذاہب کے باہمی اختلاف کو غیر اہم قرار دیتا ہے بلکہ اس کو ماننے کے بعد خدا پرستی اور الحاد میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

اس انتہائی نامعقول بات کو رواج دینے کی کوشش جو لوگ کر رہے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اگر اپنی اپنی صداقت پر اصرار کریں تو ان میں باہم کشمکش ہوگی اور انسان

ایک دوسرے سے لڑنے لگے گا۔ اس لئے حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ ہر مذہب کو صحیح مان لیا جائے۔

مگر کسی ایک مذہب کی صداقت پر اصرار کو صرف اس بنا پر غلط نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے دوسرے مذہب والوں سے کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ اولاً تاریخ میں اس قسم کے جتنے جھگڑے ملتے ہیں ان میں بیشتر وہ ہیں جن کی ذمہ داری مذہب پر نہیں بلکہ مذہب کے ماننے والوں پر ہے۔ کسی نظریے کے ماننے والے جو عمل کریں اس کو لازمی طور پر اصل نظریے کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اگر مہاتما گاندھی چورا چوری کے واقعہ کو ستیا گرہ کی روح کے خلاف قرار دینے میں حق بجانب تھے، اگر پولیس اور سرکاری عملہ کی بدعنوانی کے لئے قانون کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا تو یقیناً ہمیں ماننا ہوگا کہ اہل مذاہب کی غلطی کو مذہب کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج معاملات کے اوپر سے مذہب کی گرفت بہت ڈھیلی ہو چکی ہے مگر اس کے باوجود انسان کے درمیان باہمی لڑائیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ آج ہم کو تیسری عالمی جنگ کا خطرہ درپیش ہے جو اگر چھڑی تو وہ تاریخ کا ہولناک ترین فساد ہوگا۔ حالاں کہ اس جنگ کے اسباب پیدا کرنے میں مذہب کا بالکل کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ پھر باہمی فسادات کا رشتہ مذہب سے جوڑنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ محض اختلاف اور کش مکش کا پیدا ہونا کسی نظریے کو جانچنے کا کوئی صحیح طریقہ نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر صداقت اس قسم کی کش مکش پیدا کرتی ہے۔ اس سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کو معیار قرار دیا جائے تو محکوم ملکوں کی جدوجہد آزادی کو غلط قرار دینا پڑے گا۔ کیوں کہ اس سے حکمراں طبقہ اور محکوم طبقہ کے درمیان کش مکش پیدا ہوتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق تمام مزدور تحریکیں غلط ہیں کیوں کہ ان کی وجہ سے سرمایہ و محنت کے بے شمار جھگڑے پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح بہت سے نظریات جن کی صداقت پر آپ یقین رکھتے ہیں ان کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ کیوں کہ ان کی وجہ سے آپ کو ان لوگوں سے اختلاف کرنا پڑتا ہے جو آپ کے نظریہ کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

مذہب کا شخصی تصور

تمام مذاہب کو یکساں قرار دینے کا اتنا غلط نظریہ پیدا کس طرح ہوا۔ جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل مذہب کے بارے میں غلط طرز فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ ان

ذہنوں کی پیداوار ہے جو الہام کو نہیں مانتے اور مذہب کو صرف یہ حیثیت دیتے ہیں کہ وہ حقیقت کی تلاش میں انسانی کوششوں کا مظہر ہے۔ اگر آپ خدائی الہام کو مذہب کا ماخذ قرار دیں تو ظاہر ہے کہ حقیقت صرف وہ ہوگی جو الہام کے ذریعہ معلوم ہوئی ہو۔ اس کے باہر کسی مذہبی حقیقت کا وجود ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر مذہب صرف انسان کی تلاش و جستجو کا نام ہے تو ایسی صورت میں یقیناً اس کا کوئی متعین معیار نہیں ہوسکتا۔ ایسی صورت میں قدرتی طور پر ہر شخص کی رائے الگ الگ ہوگی۔ اس لئے ہر شخص کا مذہب بھی دوسرے سے مختلف ہونا چاہئے۔ وحدتِ ادیان کے نظریے کی اصل فلسفیانہ بنیاد یہی ہے۔ اس کے سوا جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور دیگر مصالح کے تحت وقتی طور پر وجود میں آئے ہیں۔

اس تصور کے مطابق مذہب ایک شخصی وجدان ہے۔ آدمی اپنی تپیا اور اپنی ریاضتوں کے ذریعہ حقیقتِ عالم سے اپنا تعلق جوڑتا ہے اور اس کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ اسی کا نام مذہب ہے۔ جی۔ آر۔ ایس۔ مڈ (Mead) لکھتے ہیں:

"سچائی کا آفتاب ایک ہے اور اس کی کرنیں تمام انسانوں کے دلوں اور دماغوں پر پڑتی ہیں۔ خدا کا اپنے بندوں کے ساتھ جو پدرانہ تعلق ہے اس کی بنا پر ہم کو اس کا یقین کرنا پڑے گا۔"

G.R.S. Mead, Good Reading, p. 129

ہوورڈ ڈی۔ ولیس لکھتے ہیں:

"مذہب آخری حقیقت کو معلوم کرنے کے لئے ایک عالمگیر، مختلف النوع اور کبھی نہ ختم ہونے والی جستجو ہے۔ اس جستجو میں کامیاب ہونے کے لئے اس ہمدردانہ آزادیٔ رائے کی ضرورت ہے کہ بہت لوگ کوشش کرتے ہیں مگر چند لوگ پاتے ہیں۔" (حوالہ مذکور)

ڈاکٹر رادھاکرشنن لکھتے ہیں:

"مذہب ایک وارداتِ قلب ہے جس سے انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ یہ خدا کے بارے میں کوئی علمی نظریہ نہیں بلکہ ایک روحانی شعور ہے۔ عقائد و اعمال، رسوم و عبادات، یہ سب چیزیں معرفت نفس اور عرفان الٰہی کے تابع ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی روح کو عالم ظاہر سے ہٹا کر باطن پر مرکوز کرتا ہے اور یکسوئی کے ساتھ سرگرم طلب ہوتا ہے تو اس پر یکایک ایک انوکھی، پاک، حیرت انگیز

واردات گزرتی ہے جو اندر ہی اندر سلگتی رہتی ہے اور اس کی ہستی پر چھا جاتی ہے، اس کی ہستی بن جاتی ہے۔"

قومی تہذیب کا مسئلہ ، ب

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حقیقت کا کوئی ایک تصور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر آدمی جو کچھ کہہ دے اسی کو حقیقت ماننا پڑے گا۔ جس تصور کو جانچنے کے لئے کوئی متعین معیار نہ ہو بلکہ آدمی کا اپنا ذاتی وجدان ہی اس کا ماخذ ہو، ایسے تصور کے متعلق کسی شخص کو صحیح یا غلط کہنے کا کیا حق۔ جب ہر آدمی الگ الگ حقیقت کی دریافت کرتا ہے تو ہر شخص کے نزدیک حقیقت کا تصور بھی الگ الگ ہونا چاہئے۔ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں:

"یہ میرا تجربہ ہے کہ اپنے نقطۂ نظر سے میں ہمیشہ حق پر ہوتا ہوں اور اپنے دیانت دار ناقد کے نقطۂ نظر سے اکثر ناحق پر۔ میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح ہیں۔....... سات اندھے آدمی جنھوں نے ہاتھی کے متعلق سات مختلف بیانات دیے تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح تھا اور دوسرے کے نقطۂ نظر سے غلط ...... میں اس تعدد صداقت (Manyness of reality) کے اصول کو بہت پسند کرتا ہوں۔ یہی وہ اصول ہے جس نے مجھے سکھایا ہے کہ میں مسلمان کو اس کے اپنے نظریے کے مطابق دیکھوں اور عیسائی کے بارے میں اس کے اپنے نظریے کے تحت فیصلہ کروں۔"

My Religion, pp. 20-21

مذہب کے مندرجہ بالا تصور میں نہ صرف یہ کہ نبوت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ وہ "ختم نبوت" کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ کیوں کہ مذہب جب حقیقت کو دریافت کرنے کے لئے انسان کی جدوجہد ہے تو دوسری انسانی کوششوں کی طرح مذہب کو بھی ہمیشہ ارتقاء پذیر ہونا چاہئے۔ اس تصور میں دور سابق کے کسی پیشوا کی دائمی رہنمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مہاتما گاندھی مذہب میں رواداری (Tolerance) کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اگر ہم پوری سچائی کو پالیں تو ہم محض متلاشی حق نہیں رہیں گے بلکہ خدا کے ساتھ ایک خدا کی حیثیت اختیار کرلیں گے۔ کیونکہ سچائی ہی خدا ہے۔ مگر صرف متلاشی ہونے کی صورت میں ہم اپنی تلاش جاری رکھیں گے اور اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ ہم ابھی ناقص ہیں۔ اور جبکہ ہم خود

ناقص ہوں، ایسی صورت میں ہم جس مذہب کو اختیار کئے ہوئے ہوں گے وہ بھی ناقص ہوگا۔ ہم نے ابھی مذہب کو اس کی مکمل صورت میں نہیں پایا ہوگا۔ جس طرح ہم نے ابھی خدا کو نہیں پایا ہوگا۔ اس طرح نامکمل ہونے کی وجہ سے ہمارا مذہب ہمیشہ ارتقاء کے عمل سے گزرتا رہے گا اور اس کی بار بار تعبیریں ہوں گی۔ صرف اسی طرح کے عمل ارتقاء کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ سچائی اور خدا کے بارے میں انسان ترقی کر سکے۔ اور اگر انسان کے بنائے ہوئے تمام عقیدے نامکمل ہیں تو ایک دوسرے میں تقابل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تمام عقیدے سچائی کا انکشاف کرتے ہیں۔ مگر تمام کے تمام نامکمل ہیں اور سب میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔"

My Religion, 1955, p.20

مشہور مغربی مورخ آرنلڈ ٹائن بی کا خیال ہے کہ "انسانی تاریخ میں یہ تصور نسبتاً دیر میں آیا ہے کہ بعض مذاہب بہتر ہیں اور ان کو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہونا چاہئے۔ یہ تصور ابتدائی سماج میں نہیں پایا جاتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اعلیٰ روحانی نقطۂ نظر کے مطابق اس طرح کے مذاہب یقیناً ناقص تھے۔ مگر وہ ایک منفی اہمیت ضرور رکھتے ہیں۔ وہ مختلف مذاہب کے درمیان "جیو اور جینے دو" (Live and let live) کے ذہن کی پرورش کرتے ہیں۔" وہ لکھتا ہے:

"یہ انسانی تاریخ کی ایک ستم ظریفی ہے کہ علمی روشنی جس نے مذہب میں ایک خدا اور انسانی اخوت کا تصور پیدا کیا اسی کے ساتھ وہ تعصب اور جبر بھی لایا ہے۔" ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں کہیں اور جب کبھی اعلیٰ مذہب (Higher religion) کی تبلیغ کی گئی ہے، تعصب اور جبر کے ہیبت ناک واقعات ضرور وجود میں آئے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رواداری (Toleration) کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تمام مذاہب کے بارے میں یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ مشترک روحانی منزل کی تلاش ہیں۔ اگرچہ ان جستجوؤں میں بعض زیادہ ترقی یافتہ ہو سکتے ہیں یا دوسروں کے مقابلے میں ان کی تلاش زیادہ صحیح لائنوں پر ہو سکتی ہے۔ مگر ایک "صحیح" مذہب کا کسی "غلط" مذہب پر جبر کرنا، بذات خود ایک اصطلاحی تضاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیوں کہ صحیح مذہب جب ظلم و جبر کرنے لگتا ہے تو وہ خود اپنے کو غلط پوزیشن میں ڈال دیتا ہے اور اپنے دعوے کی خود ہی تردید کر دیتا ہے۔"

A Study of History (Abridgement) p. 300

کلچر کا تاریخی تصور

مذہب کے متعلق جب یہ تصور ہو تو مذہب کی بنیاد پر جتنے افعال پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ظاہر ہے کہ اسی رنگ میں دیکھے جائیں گے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب کو کوئی حقیقی چیز نہ سمجھا جائے۔ بلکہ انسانی ذہن کی پیداوار قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اپنی کتاب "مذہب اور سماج" کے آخر میں لکھتے ہیں :

"تہذیب کوئی جامد یا خارج سے عائد کردہ چیز نہیں ہوتی۔ وہ عوام کا خواب ہے، وہ انسانی زندگی کی ایک تخیلاتی تعبیر ہے، وہ اسرار حیات کا ایک شعور ہے۔"

Religion and Society, p.244

اس تصور کے مطابق تہذیب اور کلچر کو کسی دائمی معیار پر جانچنے یا ان کا پابند بنائے رکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے مصلحین کو یہ بالکل ایک مناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ ملک میں مختلف تہذیبوں کو ختم کر کے ایک قومی تہذیب کو رائج کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب کی بنیاد محض شخصی تجربوں پر ہو اس میں انفرادیت پر اس قدر زور دینا بے معنی ہے۔ اس تصور کے مطابق "مشترک تعلیمی نظام" تمام فرقوں کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ "غیر حقیقی اختلافات" کو ختم کر کے "حقیقی یگانگت" پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ایک ہندستانی عالم سیاسیات اڈی اسروا تھم (Eddy Asirvatham) لکھتے ہیں :

"..... قومی تعلیم، اگر اس کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ یکساں اخلاقی معیار، صحیح اور غلط کا یکساں تصور، بیشتر معاملات میں تصورات کی یگانگت اور مختلف افراد کے درمیان سماجی اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت کو بخوبی پورا کر سکتی ہے۔ ہندستانی قومیت کو اگر ایک مضبوط پودے کی شکل میں ترقی دینا ہے تو تصورات اور معیار کی یکسانی پر زور دینا ضروری ہے۔ ہندستان میں ہندو اور مسلم کلچر نے اس حد تک ایک دوسرے پر اثر ڈالا ہے کہ آج کا ہندستانی اور پاکستانی اسلام، عرب یا دوسرے قریبی مسلم ملکوں کا اسلام نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے درمیان جو تہذیبی اختلافات ہیں ان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا نہیں چاہئے۔ اور اگر دو بڑے گروہوں (ہندو اور مسلم) کے درمیان ایک

مناسب سمجھوتہ ہو جائے تو اس قسم کے بیشتر اختلافات پس پشت چلے جائیں گے۔ تعلیم کا ایک قومی نظام وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

Political Theory, p.568

یہ ذہن کسی قوم کے کلچر کو اس قوم کی تاریخ میں دیکھتا ہے نہ کہ کسی دائمی اور ابدی نظریات کی روشنی میں۔ اس کے نزدیک کوئی مذہبی گروہ جو طور طریقہ اختیار کرلے وہی اس کا مستند کلچر ہے خواہ وہ مذہب کی اصل تعلیمات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں:

" جذبات اور مصلحتوں کو چھوڑ کر معروضی علمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے دھارے جہاں سے وہ مذہب کے سرچشموں سے نکلتے ہیں ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتے ہیں۔ ...... البتہ جب دونوں دھاروں کو زمانے کی ہوائیں ہندستان کی سرزمین پر ایک دوسرے کے قریب لے آئیں تو تاریخ اور جغرافیہ کی متحدہ قوتیں ان کو ملا کر ایک عظیم الشان دریا بنانے کی کوشش میں مصروف ہوگئیں۔" قومی تہذیب کا مسئلہ صفحہ ۳۰۰ (۱۹۵۵)

انڈین یونین کے وزیر ثقافت جناب ہمایوں کبیر صاحب نے دسمبر ۱۹۵۸ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا:

" اسلامی کلچر نے، جس کی بنیاد قرآن میں دہرائی ہوئی سادہ اور ابدی صداقتوں پر تھی، جلد ہی دنیا کی تمام معروف تہذیبوں سے مختلف عناصر لے کر اپنے اندر سمو لئے۔ یونانی فلسفہ اسلامی فکر کا ایسا لاینفک جزء بن گیا کہ ارسطو کے نظریات پر اعتراض کرنا بدعت اور الحاد خیال کیا جانے لگا۔ ایران کے نظریات و اعمال بھی اسلامی زاویۂ نظر کی ساخت و بافت میں شامل کر لئے گئے۔ یہودی، عیسائی اور رومی قانون اور نظریہ تخلیق مسلم قوم کے (تہذیبی) ورثہ کا جزو بن گئے۔ ہندستان نے بھی بہت سے میدانوں میں مسلم فکر کی آبیاری میں حصہ لیا .... اسلام کے ہندستان میں آنے سے قبل ہی اپنشد کی تعلیمات نے صوفی فکر کی نشو و نما میں مدد دی تھی۔ مسلم آرٹ اور ہنر چین کے مالا مال اور قدیم کلچر سے رابطہ رکھنے کی وجہ سے مالا مال ہوگئے۔ اسلام نے وسطی ایشیا کے سادہ اور توانا تر لوگوں کے رسوم و روایات اور قصے کہانیوں سے بھی استفادہ کیا۔ جس وقت کہ اسلام ہندستان آیا، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی مرکب اور متنوع تھا جیسی کہ وہ مالا مال ہندستانی

تہذیب جس سے اس کو سابقہ پڑا۔"

آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں :

"فکری امتزاج کے لئے زیادہ شعوری کوشش فیضی اور ابوالفضل اور ان کے بعد شاہجہاں کے دور حکومت میں داراشکوہ کے ہاتھوں ہوئی۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ ہندو فلسفۂ حیات کی طاقت اور اس کا استحکام آریائی اور غیر آریائی نقطۂ ہائے نظر کے مکمل امتزاج و تحلیل کا نتیجہ ہے۔ انسانی ذکاوت کا یہ اعلیٰ ترین فعل ہے کہ سیاہ فام اور غالباً قدیم قبائلی دیوتا کرشن کو سفید فام دیوتا ردّر یا شیو کا ہم پایہ بناکر ہندو دیوتاؤں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ وہ بے پناہ تخیل جس نے اس امتزاج کو ترقی دی اس نے امتزاج و تحلیل کو اس حد تک مکمل کر دیا کہ آج دراوڑ، آریائی اور ان دوسرے سلسلوں میں باہم تفریق و امتیاز تقریباً ناممکن ہے جو مل جل کر ہندو نقطۂ نظر کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ہندستان کی بدقسمتی تھی کہ ہندو اور مسلم نقطۂ ہائے نظر کے درمیان فکری امتزاج کی ایسی ہی کوششیں تشنۂ تکمیل رہیں۔"

مذہب کے اس تصور سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بہت سے لوگ وحدتِ ادیان کا نعرہ کیوں لگاتے ہیں یا کس بنا پر مشترکہ تہذیب پیدا کرنے کی کوشش کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ مگر اسلام کے نزدیک چوں کہ مذہب کا یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ اس لئے وحدتِ ادیان یا وحدتِ تہذیب کا نظریہ بھی اس کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مذہب کسی شخص کی قلبی واردات کا نام نہیں ہے اور نہ وہ حقیقت کی تلاش کے سلسلے میں انسانی کوششوں کا مظہر ہے بلکہ وہ منزّل من اللہ دین کا نظریہ رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک مذہب مکمل طور پر خدا کا حکم ہے جو خود خدا کی طرف سے آیا ہے۔

اس حد تک تمام صحیح مذاہب ایک ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی اعتبار سے وہ تمام مذاہب یکساں حیثیت رکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ مگر اب سے چودہ سو برس پہلے خدا کا آخری رسول آیا۔ اس نے ایک کامل شریعت پیش کی اور اس نے اعلان کیا کہ پچھلی تمام شریعتیں اللہ تعالیٰ نے منسوخ قرار دے دی ہیں اور آئندہ قیامت تک کے لئے صرف اسی کی لائی ہوئی شریعت انسان کے لئے صحیح لائحہ عمل ہوگی۔ اس طرح اب جو صورت حال ہے وہ یہ کہ زمین کے اوپر خدا کا صحیح اور مستند دین ہونے

کی حیثیت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ جو شخص خدا کی مرضی کو معلوم کرنا چاہے یا خدا کے احکام پر چلنا چاہتا ہو اس کو لازمی طور پر اسلام اختیار کرنا ہوگا۔ دوسرے کسی طریقہ کی پیروی میں وہ خدا کی رضا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں قرآن کے بعض حوالے میں اوپر نقل کر چکا ہوں۔ یہاں مزید وضاحت کے لئے دو حدیثیں درج کر رہا ہوں :

اُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّۃً وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ (مسلم) — میں تمام بنی نوع انسان کی طرف بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر رسولوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔

والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحاب النار (مسلم) — اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے جو بھی میرا پیغام سنے گا خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی اگر وہ میری لائی ہوئی چیز پر ایمان لائے بغیر مر جائے تو یقیناً وہ دوزخ میں جائے گا۔

اس حدیث کے مطابق نجات کی صورت یہ نہیں ہے کہ آدمی کسی بھی مذہب کی پیروی کر لے بلکہ نجات کے لئے ضروری ہے کہ آخری رسول کا اتباع کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور مذہب میں وحدتِ ادیان کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جس دین کا دعویٰ کھلے لفظوں میں یہ ہو کہ کامیابی کا راستہ صرف وہ ہے، وہ اپنے دعوے کے خلاف آخر یہ بات کس طرح مان لے گا کہ کامیابی حاصل کرنے کے دوسرے راستے بھی ہو سکتے ہیں (مطبوعہ زندگی، رمضان ۱۳۸۱ھ)

مذہب : ایک مطالعہ

ایک ہندو خاتون شوبھا دے (Shobha De) کا مضمون ٹائمس آف انڈیا (۱۲ جولائی ۱۹۸۷) میں شائع ہوا ہے۔ وہ ایک مندر میں داخل ہونا چاہتی تھیں۔ دروازہ پر پہونچیں تو ایک پجاری نے ان کو سخت نظروں سے دیکھا اور کہا: "اندر نہیں جا سکتے"۔ خاتون نے ابتداءً معاملہ کو نہیں سمجھا اور پارڈن (Pardon) کہہ کر آگے بڑھنا چاہا۔ مگر انگریزی لفظ بولنا ان کے معاملہ کو اور نازک بنانے کا سبب بن گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی انگریزی میں کہا :

No enter for you.

یہ پوری کا مشہور جگن ناتھ مندر تھا۔ خاتون حیرانی کے ساتھ دروازہ پر کھڑی رہیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پجاری دوبارہ ان کی طرف مخاطب ہوا اور کہا کہ "اب کیا ہے"۔ خاتون نے پوچھا کہ آخر کس وجہ سے مجھ کو مندر میں جانے سے روکا جارہا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ صرف ہندوؤں کے لیے ہے۔ بات بڑھی تو وہ ایک پنڈا کو بلاکر لے آیا۔ اس نے کہا کہ "بہن جی، آپ سمجھتے کیوں نہیں"۔ خاتون بگڑ گئیں۔ آخر پنڈا نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "جاؤ، جاؤ"۔

بعد کو مندر کے ایک آدمی نے خاتون سے کہا کہ آپ ہندو دکھائی نہیں دیتیں۔ انھوں نے کہا کہ "کیوں نہیں"۔ آدمی نے کہا: اس لیے کہ آپ بندی پہنے ہوئے نہیں ہیں۔ اس طرح بات ہوتی رہی یہاں تک کہ مندر کے آدمی نے پوچھا: "آپ کا شبھ نام"۔ خاتون نے جھنجھلا کر نام بتایا تو ایک "ماہر" بلایا گیا۔ اس نے غور کرنے کے بعد کہا: یہ ہندو نام تو ہے، مگر یہ بنگالی نام ہے۔ خاتون اس قسم کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں :

The whole sham game was reinforcing all my prejudices against the fraud of organised religion.

یہ تمام مصنوعی کھیل میرے اس مخالفانہ رجحان کو اور پختہ کر رہا تھا جو منظم مذہب کے فریب کے بارہ میں میرے اندر موجود تھا (ٹائمس آف انڈیا ۱۲ جولائی ۱۹۸۷)

ہندو خاتون آخر میں کہتی ہیں کہ اس تجربہ سے مجھے بہت دکھ پہونچا۔ مشہور ہندو رواداری

کے بجائے میرا سابقہ تنگ نظری اور تعصب کے ساتھ پیش آیا۔ وہ اپنے مضمون کو اس جملہ پر ختم کرتی ہیں :

I suddenly felt ashamed of having born a Hindu.

اچانک مجھے اپنے ہندو پیدا ہونے پر شرم محسوس ہونے لگی۔

مذہب اصلاً خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا نام ہے۔ تمام پیغمبروں نے یہ کیا کہ انھوں نے اس تعلق کی صحیح نوعیت کو بتایا۔ خدا کیا ہے اور بندہ کیا ہے۔ خدا اور بندہ کے درمیان کس طرح تعلق قائم ہو سکتا ہے۔ اس تعلق کے حدود اور نتائج کیا ہیں، یہ سب باتیں پیغمبروں نے واضح طور پر بتائیں۔ ہر پیغمبر کا یہی مشن تھا، اور اس مشن کو ہر ایک نے کامل طور پر انجام دیا۔

مگر اب اسلام اور دوسرے مذہبوں میں ایک فرق واقع ہو گیا ہے۔ دوسرے تمام مذاہب نے بعد کو وہ صورت اختیار کر لی جس کو "منظم مذہب" کہا جاتا ہے۔ پیغمبر کے بعد آنے والے لوگوں نے خود سے ایک ڈھانچہ بنایا اور اس کو مقدس قرار دے کر لوگوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی پیروی کریں۔ مزید یہ کہ ان مذاہب کی اصل ابتدائی تعلیمات محفوظ نہیں رہیں، اس لیے اب کوئی ایسی کسوٹی باقی نہیں جس پر جانچ کر اس ڈھانچہ کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جائے۔

اس معاملہ میں اسلام کا کیس بنیادی طور پر مختلف ہے۔ اسلام میں بھی اگرچہ ایسا ہوا کہ بعد کے لوگوں نے بہت سے اضافے کیے۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ اسلام کی اصل کتاب اور اس کی ابتدائی تعلیمات اپنی سابقہ شکل میں پوری طرح محفوظ ہیں۔ اس لیے ہر شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ اس کی روشنی میں جانچ کر معلوم کر سکے کہ کون سی بات خدا اور پیغمبر کی بات ہے، اور کون سی بات وہ ہے جو بعد کے انسانوں نے خود سے اضافہ کر کے خدا کے دین میں شامل کر دیا۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ اسلام میں خدا اور بندے کے درمیان کوئی اور حائل نہیں۔ جب کہ دوسرے تمام مذاہب میں بگاڑ کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ خدا اور بندے کے درمیان ایک اور طبقہ حائل ہو گیا۔ وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں "منظم مذہب" کہا جاتا ہے، وہ دراصل محرّف مذہب کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے اب صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے جو منظم مذہب نہیں۔ بقیہ تمام ادیان منظم مذہب کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔

اسلام سے پہلے کے جو مذاہب ہیں ، ان کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ وہ محفوظ حالت میں نہیں ہیں ۔ ان میں آسمانی کلام کے ساتھ انسانی کلام شامل ہو گیا ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان مذاہب میں خدا کا تصور بھی بگڑا ہوا ہے اور انسان کا تصور بھی ۔ ان میں کچھ باتیں اگر صحیح ہیں تو اسی کے ساتھ ان میں ایسی باتیں بھی ہیں جو انسان کی فطرت اور اس کی عقل کے مطابق نہیں ۔

یہاں ہم دو مثالیں دیں گے جن سے اندازہ ہوگا کہ پچھلے مذاہب میں کس طرح خدا کا تصور بھی بگڑ گیا اور انسان کا تصور بھی ۔

۱۔ جان کلوور مانسما (John Clover Monsma) نے امریکی یونیورسیٹیوں کے چالیس ایسے اساتذہ سے خدا کے بارہ میں مضامین لکھوائے جنھوں نے سائنس کے مختلف شعبوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی ۔ ۲۵۰ صفحات پر مشتمل ان مضامین کا مجموعہ پہلی بار ۱۹۵۸ میں شائع ہوا ۔ اس کا نام ہے ـــــ پھیلتی ہوئی کائنات میں خدا کا ثبوت :

The Evidence of God in an Expanding Universe

اس مجموعہ کا ایک مضمون ڈاکٹر لنڈبرگ (Walter Oscar Lundberg) کے قلم سے ہے ۔ اس کا عنوان ہے ، سائنسی طریقہ کا انطباق (Applying the scientific method) مضمون نگار لکھتے ہیں کہ نیچر میں خدا کے وجود کی واضح نشانیاں موجود ہیں ۔ پھر بھی کیا وجہ ہے کہ مغربی دنیا کے بہت سے تعلیم یافتہ لوگ خدا کے وجود کو نہیں مانتے ۔ ان کے نزدیک اس کی وجہ موجودہ مسیحی مذہب ہے نہ کہ حقیقۃً موجودہ علم ـــــ وہ لکھتے ہیں :

> In organized Christianity, there is instilled deeply in young people a concept of God created in the image of man, rather than of man created in the image of God. When such minds are later trained in science, this reversed and limiting anthropomorphic concept gradually becomes more and more imcompatible with the rational, inductive attitude of science. Ultimately, when all attempts at reconciliation fail, the concept of God may be abandoned entirely. The accompanying disillusionment and other psychological consequences discourage any thought of embracing a new concept. (p.56)

منظم مسیحیت میں ، نوجوان لوگوں کے ذہن میں ایک ایسے خدا کا تصور گہرائی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہوتا

ہے جو انسان کی صورت میں پیدا کیا گیا ، نہ کہ ایسا انسان جو خدا کی صورت میں پیدا کیا گیا۔ اس طرح کے ذہن جب بعد کو سائنسی تربیت حاصل کرتے ہیں ، تو یہ الٹا اور محدود تشبیہی نظریہ بتدریج سائنس کے عقلی اور استقرائی نقطۂ نظر کے زیادہ سے زیادہ غیر مطابق نظر آنے لگتا ہے ۔ آخر کار جب دونوں میں ہم آہنگی کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں تو خدا کا تصور مکمل طور پر ترک کر دیا جاتا ہے ۔ اس وہم کے ٹوٹنے کے بعد جو نفسیات بنتی ہے وہ دوبارہ کسی نئے تصور کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتی ۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم وہی تھی جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے ۔ دونوں ایک ہی توحید لے کر آئے ۔ مگر حضرت مسیح کے بعد ان کے پیروؤں نے آپ کی تعلیم کو بگاڑ دیا ۔ انھوں نے توحید کے تصور کو بالکل مسخ کر دیا ۔ حضرت مسیح کو ایک طرف انھوں نے خدائی کا درجہ دیا ، دوسری طرف کفارہ کے عقیدہ کو درست ثابت کرنے کے لیے ان کو سولی پر چڑھا دیا ۔ اس طرح خدا کا تصور عام انسان کی نظر میں مضحکہ خیز ہو کر رہ گیا ۔

خدا کائنات میں انتہائی عظیم دکھائی دیتا ہے ، مگر اہل مذاہب کی اپنی تعبیر میں وہ بالکل چھوٹا ہو کر رہ جاتا ہے ۔ ایک سائنس داں جو کائنات کی وسعتوں کا مطالعہ کرتا ہے ، اس کے لیے خدا کا یہ تصغیری تصور بالکل ناقابل فہم ہے ۔ چنانچہ اس قسم کے لوگ ابتداءً خاندانی حالات کے زیر اثر خدا کو مانتے ہیں ۔ مگر جب تعلیم کے ذریعہ ان کا ذہن وسیع ہوتا ہے تو وہ خدا کا انکار کر دیتے ہیں ۔

۲۔ ٹائمس آف انڈیا ہندستان کا قدیم ترین انگریزی اخبار ہے ۔ وہ ۱۸۳۸ میں جاری ہوا تھا ۔ یہ اخبار ہر اتوار کو اپنا ایک ہفتہ وار ایڈیشن نکالتا ہے جس کا نام سنڈے ریویو (Sunday Review) ہوتا ہے ۔ اس کے شمارہ ۲۴ جولائی ۱۹۸۸ میں صفحۂ اول پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کے لکھنے والے مسٹر آر پی شرما ہیں ۔ اس مضمون کا عنوان ہے ــــ مرد آقا تھے :

Men were masters

اس مضمون میں ہندوازم کا فکری اور تاریخی جائزہ لیا گیا ہے ۔ اس کے کچھ حصہ کا ترجمہ ہم کسی اضافہ یا تشریح کے بغیر یہاں نقل کرتے ہیں :

ہندوازم بنیادی طور پر ویدازم کے ہم معنی ہے ۔ قدیم آریائی دور میں ویدوں کی بنیاد پر ایک ایسا سماجی نظام بنا جس میں عورت کے بجائے مرد کو تمام خاندانی اور سماجی بڑائی حاصل تھی ۔ وید لڑکے

کی پیدائش کی دعاؤں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ویدک مناجاتوں میں اکثر بتکرار کہا جاتا ہے کہ " ہمیں مردوں والا پرپوار دے۔" کسی بھی وید میں کوئی ایسی مناجات نہیں جس میں لڑکی کی پیدائش کی درخواست کی گئی ہو۔ اس کے برعکس اس میں ایسی دعائیں اور رسمیں ہیں جو لڑکی کی پیدائش کو روکنے کے لیے بتائی گئی ہیں۔ رگ وید میں، جو کہ ویدوں میں سب سے قدیم ہے، خاندان کا بزرگ شادی کے موقع پر دلہن کو آشیرواد دیتے ہوئے جو کچھ کہتا ہے، اس میں سے ایک یہ ہے کہ: تو مردوں کی ماں بنے۔ اتھر وید کی ایک مناجات کہتی ہے کہ اے پرجاپتی، لڑکیاں کسی اور کو دے، ہم کو صرف لڑکا دے۔ بریہادرانیاک اپنشد کا پورا چھٹا باب صرف ان رسموں کے تذکرے پر مشتمل ہے جو لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں انجام دی جاتی ہیں۔

منوسمرتی کہتی ہے کہ " عورت بچپن میں اپنے باپ کے تابع رہے، جوانی میں وہ اپنے شوہر کے تابع رہے، اور بڑھاپے میں وہ اپنے لڑکوں کے تابع رہے، کیوں کہ وہ پیدائشی طور پر ناقص اور کم سمجھ ہے۔" عورت کے بارے میں ہندوازم کی ان تعلیمات کے بعد ہندو سماج میں عورت کا کیا انجام ہوا ہے، اس کے لیے صرف یہ حوالہ دینا کافی ہوگا کہ خود سرکاری رپورٹ کے مطابق، صرف ۱۹۸۵ میں شوہروں کی طرف سے بیویوں کو جلانے کے ۸۳۷ واقعات ہوئے۔ دوسری بدسلوکیاں اس کے علاوہ ہیں۔

مزید یہ کہ ہندوازم سماج کی تشکیل نسل کی اصطلاحوں میں کرتا ہے جس میں ذمہ داریاں پیدائش کی بنیاد پر مقرر ہوتی ہیں۔ جس طرح عورت اور مرد کے فرق میں صرف جنس کو ساری اہمیت دی گئی تھی، اسی طرح کسی انسان کے درجہ کے تعین میں اس کی کھال کے رنگ کو ساری اہمیت حاصل ہے جو چار درجات پر تقسیم ہے۔ اس چار درجات کی تقسیم کو چترُورن کہا جاتا ہے۔ جس کا لفظی مطلب چار رنگ ہے۔ یہ درجات پیدائش سے مقرر کیے گیے ہیں: برہمن، کھشتری، ویشیہ، شدر۔ رگ وید کی پرُشں بھجن (۱۰ : ۹۰) کے مطابق، برہمن پرُوشا کے منھ سے نکلا ہے، کھشتری اس کے بازوؤں سے، ویشیہ اس کی ران سے، اور شدر اس کے پاؤں سے۔ اس سے سماج میں ہر ایک کے درجہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ شدر کو ان بہت سی چیزوں کی اجازت نہیں جس کی اجازت بقیہ تینوں کو حاصل ہے۔ منوسمرتی کے مطابق، شُدر کی واحد ذمہ داری یہ ہے کہ وہ چپ چاپ دوسرے طبقے کے لوگوں کی خدمت کرتا رہے۔

آر پی شرمانے اس قسم کی بہت سی تفصیلات بیان کی ہیں جو اخبار کے صفحہ ۱، اور صفحہ ۵ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ مزید لکھتے ہیں:

> Looking back, the modern Hindu feels intrigued and hurt, even baffled and shocked when he tries to make out why his great ancestors decided to use the accidents of sex and birth as the sole determinants of one's rank and function in the social system. To put it bluntly, one could say with sufficient justification that those who were responsible for the establishment and continuance of the Aryan partriarchate have been guilty of sexism and racism.

پیچھے کی طرف دیکھتے ہوئے، آج کا ہندو حیرت میں پڑجاتا ہے اور دکھ محسوس کرتا ہے، حتیٰ کہ وہ چکرا جاتا ہے اور اس کو سخت جھٹکا لگتا ہے جب وہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے عظیم پرکھوں نے کیوں اس کا فیصلہ کیا کہ سماجی نظام میں ایک شخص کے درجہ اور اس کے عمل کو متعین کرنے کے لیے وہ جنس اور پیدائش کے اتفاق کو واحد فیصلہ کن چیز قرار دیں۔ اس کو برہنہ طور پر بیان کرنے کے لیے ایک شخص بجا طور پر کہہ سکتا ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے آریائی نظام کو قائم کیا اور چلایا وہ جنس پرستی اور نسل پرستی کے قصور وار تھے۔

ساری دنیا میں اب صرف ہندستان ہی ایک ایسا قابل ذکر ملک ہے جہاں قدیم شرک اب بھی زندہ حالت میں موجود ہے۔ تاہم ہندو قوم کا جدید تعلیم کے میدان میں داخل ہونا اب اس کو اپنے قدیم مذہب سے دور کرتا جارہا ہے۔ ایک طرف ان کا وہ طبقہ ہے جو قدیم روایات اور قومی تقلید کے زیر اثر ابھی تک مشرکانہ رسوم و رواج کی ادائیگی میں مشغول ہے۔ دوسری طرف ان کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو اس کو غیر فطری اور غیر علمی پاکر اس سے متوحش ہوتا جارہا ہے۔ اس سلسلہ کی مختلف مثالیں کثرت سے سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان میں سے چند بطور نمونہ یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

ٹائمس آف انڈیا میں ایک کالم رائے (Opinion) کا ہوتا ہے۔ اخبار مذکور کے شمارہ ۲ اگست ۱۹۸۸ میں دہلی کی ایک ہندو خاتون جے شری اروناچلم کا ایک تاثر شائع ہوا ہے جس کا عنوان یہ ہے:

Godliness that shatters peace

اس عنوان کے تحت انھوں نے لکھا ہے کہ کیا کوئی شخص مجھے جاگرن منعقد کرنے کا مقصد بتا سکتا ہے۔ امتحان قریب ہونے کی وجہ سے طلبہ رات کو دیر تک پڑھتے ہیں۔ ان سے کیوں کر یہ امید کی جاتی ہے کہ

اس تمام شور کے باوجود وہ مطالعہ میں اپنا ذہن لگا سکیں گے ۔ اس شور کا سلسلہ سات آٹھ گھنٹہ تک جاری رہتا ہے اور تمام پڑوسیوں کو برابر جاگنا پڑتا ہے ۔ میرا خیال ہے کہ یہ اظہار شکر کی ایک صورت ہے ۔ کیا خدا بالکل بہرا ہے کہ صرف لاؤڈ اسپیکر اور بھدی موسیقی ہی اس تک پہونچتی ہے جس کا سلسلہ تمام رات جاری رہے :

I understand it is a form of thanksgiving. Is god stone-deaf that only loud and vulgar music played all through the night will reach Him?

فکری قیادت

ہم بحران کے ایک دور سے گزر رہے ہیں۔ اقتصادی بحران، سیاسی بحران، عسکری بحران۔ مگر ان سب سے زیادہ بڑا بحران وہ ہے جس کو فکری بحران کہا جا سکتا ہے۔ آج کا انسان کسی ایسی فکری بنیاد سے محروم ہے جس پر وہ کھڑا ہو سکے۔ جس پر وہ اپنی زندگی کی بنیاد رکھے۔

قدیم دور توہم پرستی کا دور تھا۔ اس زمانہ میں انسان کے لئے یہ ممکن تھا کہ وہ مفروضات اور توہمات پر جی سکے۔ آج کا زمانہ تعقل (reason) کا زمانہ ہے۔ آج انسان تعقل پر جینا چاہتا ہے۔ مگر جب انسان ایسا کرنا چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس جینے کے لئے کوئی عقلی بنیاد موجود ہی نہیں۔

دو چیزیں ہیں جو انسان کے لئے فکری بنیاد بن سکتی ہیں ــــــ مذہب یا سائنس۔ یعنی الہامی علم یا سائنٹفک علم۔ مگر جدید انسان نے یہ دونوں ہی بنیادیں کھو دی ہیں۔

قدیم ترین زمانہ سے انسان مذہب کو اپنے لئے فکری بنیاد بنائے ہوئے تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب مذہب کو عقل کی روشنی میں دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ مذاہب عقل کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ مثال کے طور پر بائبل کو لیجئے۔ بائبل میں ایک طرف توحید کی آیت ہے:

Hear, O Israel: The Lord our God is One Lord.

(Deuteronomy 6:4)

اسی کے ساتھ بائبل کا عقیدہ رکھنے والے لوگ اسی بائبل سے تثلیث کو بھی نکالتے ہیں۔ اور اس کا ماخذ ان کے نزدیک نئے عہد نامہ کی یہ آیت ہے:

Go ye therefore, and teach all nations, baptizing them in the name of the father, and of the Son, and of the Holy Ghost.

یہ انسانی عقل کے لئے ایک ناقابل فہم بات ہے۔ کیونکہ خدا اگر ایک ہے تو وہ تین نہیں ہو سکتا۔ اور اگر

خدا تین ہے تو وہ ایک نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح نئے عہدنامہ میں ایک جگہ یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا (Son of God) کہا گیا ہے۔ (مرقس ۱ : ۱) اور اسی کے ساتھ اس میں یسوع مسیح کو داؤد کا بیٹا (Son of David) لکھا گیا ہے (Matthew 1:1) اس قسم کے تضادات بائبل میں کثرت سے موجود ہیں۔ یہ مسئلہ ہمارے عقیدہ کے مطابق، خدا کے کلام میں انسانی آمیزش سے پیدا ہوا ہے جس کو تحریف کہا جاتا ہے۔ ان تحریفات نے بائبل کو جدید انسان کے لئے ناقابل قبول اور ناقابل فہم بنا دیا ہے۔

اب سائنس کے اعتبار سے لیجئے۔ جدید سائنس کے ظہور کے بعد انسان نے یہ سمجھا کہ وہ سائنس کی فکری بنیاد پر کھڑا ہو سکتا ہے۔ مگر سائنس کی ترقی انسان کو اطمینان نہ دے سکی۔ اس نے انسان کو صرف ذہنی بحران میں مبتلا کیا۔

سائنس نے جو کائنات دریافت کی ہے اس میں مکمل نظم ہے۔ مکمل ڈیزائن ہے۔ وہ ایک نہایت بامعنی کائنات ہے۔ انسان کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ توجیہہ پسند حیوان ہے۔ چنانچہ وہ کائنات کی توجیہہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر جدید سائنس داں خدا کے بغیر کائنات کی توجیہہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کی توجیہہ کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہیں۔ یہی وہ احساس ہے جس کا اظہار شروڈنگر اور دوسرے سائنس دانوں نے ان الفاظ میں کیا کہ فطرت کے بارہ میں سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ وہ قابل فہم ہے:

> ....there are aspects which are extremely difficult to understand. A famous remark of Einstein — and other people have said similar things, Schrodinger in particular — that the most comprehensible thing about nature is that it is comprehensible.

جدید انسان کی یہی وہ صورت حال ہے جس کو میں نے فکری بحران کہا ہے۔ آج کا انسان بہت بڑے پیمانہ پر اپنے آپ کو اس فکری بحران میں گھرا ہوا پاتا ہے، وہ اپنے لئے ایک فکری بنیاد حاصل کرنے کے لئے مذاہب کی طرف دیکھتا ہے۔ مگر مذاہب (تحریف کی بنا پر) اس کے عقلی معیار پر پورے اترتے نظر نہیں آتے۔ اس کے بعد وہ سائنس کی طرف دیکھتا ہے مگر سائنس بھی اسے ذہنی اطمینان عطا نہیں کرتی۔

اس فکری بحران کا حل صرف ایک ہے اور وہ غیر محرف مذہب ہے جس کو اسلام کہا جاتا ہے۔

اسلام تحریف سے پاک ہے وہ اپنی اصل الہامی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ اس بنا پر وہی اس پوزیشن میں ہے کہ جدید انسان کو فکری رہنمائی دے سکے۔ اسلام انسان کو ایک طرف وہ سچا مذہب عطا کرتا ہے جو اس کی فطرت کے عین مطابق ہے اور اس کو خالص توحید کا وہ عقیدہ فراہم کرتا ہے جس سے وہ کائنات کی توجیہہ کر سکے۔ آج انسانیت کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اس کو اسلام سے متعارف کیا جائے جو واحد نظام ہے جو انسانیت کو فکری بحران سے نکال سکتا ہے۔

یہاں میں دو واقعہ نقل کروں گا جو علامتی طور پر بتاتا ہے کہ کس طرح اسلام انسانیت کو موجودہ فکری بحران سے نکال کر اس حالت تک پہنچانے والا ہے جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: سن لو، اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان ملتا ہے (۱۳ : ۲۸)

۱۔ ڈاکٹر نشی کانت چٹو پادھیائے انڈیا کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۴ میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ انھوں نے اپنے ذہنی سفر کا حال ایک کتاب میں بیان کیا ہے جس کا نام ہے:

Why have I accepted Islam?

ڈاکٹر چٹو پادھیائے لکھتے ہیں کہ جب میں بڑا ہوا تو مجھے اپنے آبائی مذہب سے بے اطمینانی ہو گئی۔ اس کے بعد میں نے مذاہب کا مطالعہ شروع کیا۔ مگر ہر مذہب مجھے غیر تاریخی نظر آیا۔ ان کی کتابیں اور ان کی شخصیات کوئی بھی تاریخ کے معیار پر پوری اترتی نظر نہیں آئیں۔ آخر میں انھوں نے اسلام کا مطالعہ کیا تو اسلام اور پیغمبر اسلام کی ایک ایک چیز انھیں مکمل طور پر تاریخ کی روشنی میں نظر آئی۔ انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اپنی کتاب میں یہ جملہ لکھا ہے کہ اف، اس پانے میں کیسی راحت ہے کہ آدمی آخر کار ایک سچے تاریخی پیغمبر کو پالے جس پر وہ یقین کر سکے:

Oh! what a relief to find, after all, a truly historical Prophet to believe in.

۲۔ فرانس کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ڈاکٹر گارودی کو حقیقت کی تلاش ہوئی۔ انھوں نے مختلف فلسفہ اور مذاہب کا مطالعہ کیا یہاں تک کہ وہ اسلام پر مطمئن ہوئے اور ۱۹۸۲ میں انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے اسلام کیوں قبول کیا تو انھوں نے کہا میں نے اسلام اس لئے قبول کیا تاکہ میں اپنی زندگی کو بامعنی بنا سکوں۔

یہ دونوں واقعہ علامتی طور پر بتاتا ہے کہ آج کے انسانوں کو سب سے زیادہ کس چیز کی ضرورت ہے۔ آج کے انسان کو سب سے زیادہ اس چیز کی ضرورت ہے جس کو ڈاکٹر بریڈلے نے نیو ریلیجن کہا تھا۔ اور جس کا متعین نام اسلام ہے۔ یہ سب سے بڑی چیز ہے جس کو موجودہ مسلمان عالم انسانیت کو دے سکتے ہیں۔

یہاں میں یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کو اسلام کا پیغام دینا سادہ طور پر محض اعلان کا معاملہ نہیں ہے یہ عظیم صبر کا معاملہ ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ زمانہ کی مدعو اقوام سے طرح طرح کی ایذائیں پہنچ رہی ہیں۔ اس کے ردعمل میں ایسا ہوا ہے کہ مسلمان اپنی مدعو اقوام کے خلاف غصہ اور شکایت کی نفسیات سے بھر گئے ہیں۔ اس طرح کی نفسیات کے ساتھ دعوت کا کام نہیں کیا جاسکتا۔ دعوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے مسلمانوں کو ردعمل کی نفسیات سے اوپر اٹھنا ہوگا۔ انھیں مدعو اقوام کی ڈالی ہوئی ایذاؤں کو یک طرفہ طور پر برداشت کرنا ہوگا۔ اس قربانی کے بعد ہی وہ موجودہ دنیا میں اسلام کے داعی بن سکتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں پیغمبروں کی زبان سے ان لفظوں میں بتائی گئی ہے کہ ہم ضرور تمہاری ایذاؤں پر صبر کریں گے (۱۴ : ۱۲)

آخر میں میں کہوں گا کہ جدید انسان کا فکری بحران میں مبتلا ہونا اور مسلمانوں کے پاس اجارہ داری کی حد تک اس فکری بحران کا حل موجود ہونا مسلمانوں کو یہ موقع دے رہا ہے کہ وہ آج کی دنیا کے فکری قائد بن سکیں۔ مگر یہ عالمی قیادت انھیں صرف صبر کی زمین پر ہی مل سکتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا قرآن میں ان الفاظ میں اعلان کیا گیا:

ہم ان کو آفاق میں اور خود ان کے اندر اپنی نشانیاں دکھائیں گے، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے (۴۱ / ۵۳)

AL-RISALA represents a mission, the aims and objectives of which are to proclaim a divine message. It is a voluntary effort, which belongs to everyone who is in accord with the message it proclaims. Such people are invited to join us in this divine cause. And assist in conveying the truth to those around them.

SUBSCRIPTION RATES

	INLAND	ABROAD Air-Mail
English	**Rs.**	**US$**
1 Year	70	20
2 Years	120	35
3 Years	175	50
5 Years	300	80
Urdu		
1 Year	90	20
2 Years	170	35
3 Years	250	50
5 Years	400	80

Please send your cheques/bank drafts favouring to "Al-Risala Monthly".

God has entrusted you with a message to be communicated to the rest of the world. Are you ready to fulfill the trust?

Gift AL-RISALA to your friends and relatives. Subscribe NOW!

AL-RISALA BOOK CENTRE
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013
Tel. 4611128, 4611131 Fax 91-11-4697333
e-mail: risala.islamic@axcess.net.in

Ask for a free specimen copy.